جلد 61 عدد ۳ دسمبر ۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے معاشی نظام پر چند معرکہ آرا کتب

اسلام اور
جدید معاشی نظریات

— از سید ابوالاعلیٰ مودودی —

— موجودہ عمرانی مسائل کا تاریخی پس منظر،
— جدید نظامِ سرمایہ داری۔ سوشلزم اور کمیونزم کا تجزیہ — اسلامی نظامِ معیشت کے بنیادی ارکان — جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل

قیمت :- ۲/۲۵ روپے

سُود

— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- حرمتِ سود
- جدید بینکنگ اور تجارتی قرضوں کے متعلق اسلامی احکام اور مفصل بحث۔

— قیمت : قسم اعلیٰ ۵/۵۰ روپے —

— سستا ایڈیشن ۲/۲۵ روپے —

اِسلام کا نظامِ عدل

از:- اُستاذ سید قطب (مصر)

ترجمہ :- محمد نجات اللہ صدیقی ایم اے

ایک ایسی کتاب جس نے عرب، یورپ اور امریکہ میں دھوم مچادی جس کو عربی، انگریزی اور فرنچ کے بعد اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اسلام کے معاشی نظام پر ایک معرکہ آرا کتاب

قیمت
۱۰ روپے

اِنسان اور اُس کے مسائل

— از مولانا جلال الدین انصر عمری —

- ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟
- انسانی مسائل کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟

— اِن اہم موضوعات پر مفصل بحث —

— عمدہ کتابت و طباعت —

قیمت :— ۱/۶۰ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۱	دسمبر ۱۹۶۳ء	عدد ۳

دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

سالانہ چندہ: سات روپے ——— قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جماعت اسلامی کے کُل پاکستان اجتماع کے موقع پر لاہور میں جو کچھ ہوا وہ درحقیقت ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا المناک سانحہ ہے۔ کرایہ پر لائے ہوئے چند غنڈوں نے جن کو پہلے شراب پلائی جا چکی تھی، شریف انسانوں کے ایک پُرامن مجمع پر دن دہاڑے حملہ کیا، اور اپنی بدمستی میں یہاں تک بڑھ گئے کہ خواتین کے کیمپ پر اینٹیں اور بوتلیں پھینکیں، قرآن مجید کی جلدیں اٹھا اٹھا کر پتھروں اور اینٹوں کی طرح لوگوں کو ماریں، اور فائرنگ کرکے ایک بے گناہ انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کتنی المناک اور روح فرسا ہے یہ خبر اور کتنا بڑا گھاؤ ہے جو اسے سُن کر سینے میں پڑتا ہے۔

عقل کے جن اندھوں نے اس سارے شرمناک خونی ڈرامہ کی ہدایت کاری کا اہم فرض "سرانجام" دیا ہے، ممکن ہے اُن کے لیے یہ کوئی "عظیم کارنامہ" ہو اور اس "مہم" کو سر کرنے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہوں لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فہم و بصیرت کی تھوڑی سی مقدار بھی دی ہے اور جن کی نظروں کو زینتِ حیاتِ دنیا کی عارضی چمک دمک نے بالکل خیرہ نہیں کر دیا ہے، ان کے لیے یہ حادثہ اپنے اندر فتح و کامرانی کا کوئی پہلو نہیں رکھتا بلکہ اخلاقی شکست کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ یہ واقعہ اگر ایک طرف اس بات کا اظہار ہے کہ اہل غرض اپنے مفاد کی حفاظت کی فکر میں کہاں تک جا سکتے ہیں، تو دوسری طرف یہ اللہ کے قانونِ مکافات کو حرکت میں لانے کے لیے ایک دعوت بھی ہے۔ اگرچہ اغراض کے پیچھے اندھے ہو جانے والے لوگ اس بات کو ہمیشہ بھولے رہتے ہیں کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان کے کرتوتوں کو دیکھ رہا ہے اور اس کے ہاں کوئی قانون مکافات بھی ہے جس میں دیر تو ہوتی ہے مگر اندھیر کبھی نہیں ہوتا۔

یہ کچھ عجیب ہی سا معاملہ ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ اجتماع عام ایک ایسے ماحول میں ہوا جس پر ابتدا ہی سے نحوست کے بادل منڈلانے شروع ہو گئے تھے۔ ذرا پلٹ کر گزرے ہوئے واقعات پر ایک نگاہ ڈالیے:

جولائی ۱۹۶۳ء کے آغاز میں مرکزی مجلس شوریٰ نے اس امر کا فیصلہ کیا کہ جماعت کا کل پاکستان اجتماع ۲۵ سے ۲۸ اکتوبر تک لاہور میں منعقد ہو گا۔ اجتماع کے انتظامات کے لیے جو کمیٹی تشکیل کی گئی اس نے طے کیا کہ اجتماع کے لیے موزوں جگہ اقبال پارک (منٹو پارک) ہے۔ چنانچہ ۳۰ جولائی کو ناظم اجتماع نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کو اس مضمون کی درخواست دی کہ ۱۶ اکتوبر سے ۳۱ اکتوبر تک کے لیے اس پارک کو ہمارے لیے مختص کر دیا جائے اور ہمیں اس عرصہ میں اسے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب نے ناظم باغات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جنہوں نے معاملہ کو ہوم سکرٹری کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ناظم اجتماع نے ہوم سکرٹری صاحب کے دفتر کے طواف شروع کیے اور انہوں نے حکم صادر کرنے میں جس دفتری لیت ولعل سے کام لیکر اس معاملہ کو معرض التوا میں ڈالا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کسی اچھے رخ کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ بالآخر تنگ آکر ۲ اکتوبر ۶۳ء کو قیم جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد صاحب نے گورنر مغربی پاکستان کو اور ناظم اجتماع نے ہوم سکرٹری صاحب کو توجہ دلائی کہ اجتماع کے انتظامات کے لیے ہمیں کم از کم تین ہفتہ پہلے اجازت ملنی ضروری ہے۔ لہٰذا اگر ۵ اکتوبر تک ہمیں اجازت نہ دی گئی تو ہم عوام کے سامنے یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ حکومت مغربی پاکستان نے ہمیں اجتماع کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر آخر کار اقبال پارک کی کھلی جگہ کو چھوڑ کر آبادی کے درمیان شاہراہ عام پر وہ تنگ میدان جماعت کو دیا گیا جو بھاٹی دروازے اور ٹکسالی کے درمیان واقع ہے۔

اس مسلسل تعویق اور لیت ولعل سے اجتماع کے منتظمین کو انتظام میں جس قسم کی عملی دشواریاں پیش آئیں اور اس میں شریک ہونے والے احباب کو جس قسم کے ذہنی اضطراب سے گزرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ وہی لوگ

کر سکتے ہیں جنہیں اس صورتِ حال سے کبھی سابقہ پیش آیا ہو۔ ایک طرف ملک کے گوشے گوشے سے پا بہ رکاب لوگ تذبذب میں گرفتار ہو کر بار بار اجتماع کے بارے میں استفسار کر رہے تھے، دوسری طرف منتظمین بیچارے یقین کے ساتھ کوئی جواب دینے سے قاصر تھے۔ تذبذب اور بے یقینی کی اس فضا میں جماعت کے کارکنوں پر جو گزری اور انہیں جس قسم کے نقصانات برداشت کرنے پڑے وہ تو ایک الگ داستان ہے۔ لیکن اس معاملہ کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس مسلسل "آنکھ مچولی" کے بعد اجتماع کے لیے جو جگہ عطا کی گئی وہ اس کام کے لیے کسی اعتبار سے موزوں نہ تھی۔ مقام کی یہ تبدیلی کن مصالح کی بنا پر کی گئی، اس کو تو وہی ذات جانتی ہے جو عالم الغیب والشہادہ اور علیم بذات الصدور ہے۔ مگر بعد کے واقعات اس فیصلے کی صحت کے بارے میں کوئی نیک گمان قائم کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔

اس کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت کا مرحلہ پیش آیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ملک کی ایک مسلّم جماعت جو ۲۲ سال سے کام کر رہی ہے، اپنا کُل پاکستان اجتماع منعقد کرتی ہے، لیکن اُسے لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ اتنے بڑے اجتماع کی کارروائی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہونی محال ہے اور اس سے محروم کرنے کے معنی عملاً اجتماع کو روکنے کے ہیں۔ جماعت اسلامی کی طرف سے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا تو حکومت نے عدالت کا فیصلہ صادر ہونے سے پہلے فوراً ایک آرڈیننس نافذ کر دیا۔ اس ایک واقعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں انتظامیہ کو آرڈی ننسوں کے ذریعہ سے قانون سازی کے جو غیر معمولی اختیارات دیئے گئے ہیں وہ کس طرح استعمال کیے جاتے ہیں۔

ان سب موانع کے باوجود جب اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ ہی کر لیا گیا تو اجتماع سے دو تین روز پہلے مرکزی اور صوبائی وزراء نے یکایک جماعت اور اس کے امیر کے خلاف بیانات کی ایک

مہم شروع کر دی۔ یُوں نظر آتا ہے کہ ۲۳ اکتوبر کو اچانک ان پر یہ راز منکشف ہو گیا تھا کہ یہ جماعت اور اس کا قائد ملک و ملت کے دشمن ہیں، اس لیے فوراً انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اجتماع سے پہلے پہلے عوام کو اس سے خبردار کر دیں تاکہ ملک کو کوئی نقصانِ عظیم نہ پہنچ جائے۔ حالانکہ نہ جماعت اسلامی کوئی نئی جماعت تھی اور نہ اس کا امیر کہیں یکایک خلاء میں سے زمین پر آن اترا تھا۔ امیر جماعت کو اس برِعظیم میں کام کرتے ہوئے چالیس سال گزر چکے ہیں اور اس مدت میں ان کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات لاکھوں آدمیوں نے پڑھے ہیں اور ملک کے ہزارہا گھروں میں ان کی کتابیں موجود ہیں۔ اسی طرح جماعت اسلامی ۲۲ سال سے اس برِعظیم میں کام کر رہی ہے۔ اور اس کا عیب و صواب جو کچھ بھی ہے سارے ملک پر عیاں ہے۔ جماعت کی ہیئت، اس کا طریقِ کار، اس کا دستور، اس کا منشور، اس کی قراردادیں اور اس کی آج تک کی تاریخ، غرض کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو معلومِ عوام نہ ہو اور پہلی مرتبہ ہی ان حضرات پر منکشف ہو گئی ہو۔ اب یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ اجتماع سے دو تین روز پہلے آخر کیا نئی بات ایسی پیش آ گئی تھی جسے طشت از بام کرنے کے لیے ان وزرا کو ایک تازہ مہم چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر اس تازہ مہم میں بھی انہوں نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا بلکہ پندرہ پندرہ اور بیس بیس سال پرانی باتیں ہی دُہرانی شروع کر دیں، گویا کہ یہ اب ان کے علم میں آئی ہیں۔

اس کے بعد اجتماع میں جس شرمناک کھیل کا مظاہرہ ہوا، اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے اُسی قدر کم ہے۔ یُوں محسوس ہوتا تھا کہ شیطنت، تہذیب و شائستگی کے سارے پردے اتار کر اب ننگا ناچ ناچنے میں منہمک ہے۔ ایک طرف تہذیب و شرافت تھی اور دوسری طرف گندی گالیاں۔ ایک جانب مظلومانہ مدافعت تھی اور دوسری جانب دراز دستیاں۔ ایک طرف صبر و وقار تھا اور دوسری طرف نہایت ذلیل قسم کی غنڈہ گردی۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کے محافظوں کے سامنے کھلے بندوں ہو رہا تھا اور وہ اسے بالکل تماشائیوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا مشاہدہ دو چار آدمیوں نے نہیں ہزاروں حاضرین نے

کیا ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ غنڈے بیس پچیس سے زیادہ نہ تھے۔ شہر کے جانے پہچانے بدمعاش تھے جن سے پولیس کا ناواقف ہونا ممکن نہیں ہے۔ اجتماع میں کوئی ہڑبونگ نہ تھی کہ غنڈے اس میں چھپ جاتے۔ ساری اجتماع گاہ میں وہی چند آدمی کودتے پھر رہے تھے اور علانیہ سب سے الگ نظر آرہے تھے۔ اور انہی میں سے ایک نے پولیس کی آنکھوں کے سامنے ایک بے گناہ کارکن کو قتل کیا۔ لیکن امن کے کسی محافظ نے ان غنڈوں کو گرفتار نہ کیا۔ اور آج اُن کو یہ تحقیق کرنے میں بھی مشکل پیش آرہی ہے کہ قاتل کون تھا۔

یہاں انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے یہ غنڈہ گردی کی ہے، انہیں ایک دینی یا سیاسی جماعت کے جلسے سے بذاتِ خود کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ جن لوگوں کا شیوہ مسافروں کی گرہیں کاٹنا ہے، سینماؤں کے ٹکٹوں کی بلیک کرنا ہے، جُوا کھیلنا ہے، انہیں آخر کونسی جاذبیت جماعت اسلامی کے "غیر دلچسپ" اجتماع میں کھینچ کر لے آئی۔ ایک ایسا اجتماع جس میں کسی قوالی یا ریکارڈنگ کا انتظام موجود نہ ہو۔ جس میں کسی چٹخے دار تقریر کی بھی گنجائش نہ ہو۔ حتیٰ کہ جس میں لاؤڈ سپیکر بھی موجود نہ ہو، اس میں ان "اصحابِ ذوق" کی تشریف آوری کیسے ہوئی۔ یہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ تو اس قسم کی بے کیف مجالس کے سایے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ مگر یہاں اُن کا یہ حال تھا کہ وہ ایک گروہ کی صورت میں اُمڈے چلے آرہے تھے۔

یہ واقعہ محض اس بنا پر کسی کے لیے خوش آئند نہیں ہونا چاہیے کہ یہ جماعت اسلامی کے ساتھ پیش آیا ہے جس سے کچھ لوگ ناراض ہیں۔ درحقیقت یہ ہماری قومی زندگی کے لیے ایک خطرہ ہے جسے اگر پرورش پانے دیا گیا تو ہمارے قومی معاملات سنجیدہ بحث و کلام اور آئینی طریقِ کار سے طے ہونے کے بجائے دنگے اور فساد سے طے ہونے لگیں گے اور شریف و معقول آدمیوں کے لیے یہاں کام کرنا ممکن نہ رہے گا۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد توقع تھی کہ اربابِ اختیار سنجیدگی کے ساتھ سارے معاملے پر پھر غور کریں گے اور کم از کم اب تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسی حزبِ اختلاف کے اصول، مقصد اور کام کو خواہ وہ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں، مگر انہیں معقول جمہوری طریقوں ہی سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس کے خلاف نفرت پھیلانے سے باز رہنا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ توقع بھی پوری نہ ہوئی بلکہ نفرت انگیزی کی مہم پہلے سے زیادہ زور شور کے ساتھ چل رہی ہے اور جماعت اور امیرِ جماعت پر ایک سے ایک بڑھ کر گھناؤنے الزامات بے تحاشا لگائے جا رہے ہیں۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اتنے وسیع و عریض ملک پر اختیار و اقتدار بخشا ہے اور جنہیں کروڑوں بندگانِ خدا کی عزت و آبرو اور جان و مال کا امین بنایا گیا ہے، اُن کے ظرف میں بھی کافی وسعت ہونی چاہیے جو لوگ ذرا ذرا سے اختلاف پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جاتے ہوں، اور اختلاف کرنے والوں سے وہ سلوک شروع کر دیتے ہوں جس کا مظاہرہ ہم جماعت اسلامی کے معاملے میں دیکھ رہے ہیں، ان کے فہم و تدبر کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ حکومت و فرمانروائی بشرطیکہ اس کا مقصد فی الواقع اہلِ ملک ہی کی خدمت ہو، بڑی نازک ذمہ داری ہے اور اس سے وہی لوگ بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو صرف مدح و توصیف سننے کے آرزومند نہ ہوں بلکہ تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں۔ جو حضرات ملک کی زمام کار اس مفروضہ کے ساتھ سنبھالتے ہیں کہ ملک کی پوری آبادی اپنے ذہن، شعور، احساس اور ضمیر کو برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ میں گروی رکھ کر۔ اس سے اپنی وفاداری استوار کرے گی۔ وہ خود اپنے لیے اور پوری قوم کے لیے بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ تنقید کا ہر حرف لازمی طور پر فسادِ نیت ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا اور اختلاف کی ہر آواز ہمیشہ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے ہی بلند نہیں کی جاتی۔ اختلاف نیک نیتی سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور قوم میں کوئی گروہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ایمانداری کے ساتھ کچھ باتوں کو غلط سمجھ کر ان کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو۔ اس بنا پر یہ سمجھ لینا کہ اتنے بڑے ملک میں جو شخص یا گروہ بھی اقتدار کے نقطۂ نظر سے سو فیصدی متفق نہیں ہوتا وہ لازمی طور پر ملک و ملت کا دشمن ہی ہے۔ بہت

بڑی غلطی ہے اور اس کا جس قدر جلدی ازالہ کر لیا جائے اتنا ہی ملک اور حکمراں طبقے دونوں کے لیے بہتر ہے۔ جماعت اسلامی ۱۶ سال سے پاکستان میں کام کر رہی ہے اور ان ۱۶ برسوں میں یہاں کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے۔ مگر کوئی شخص ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کر سکتا کہ اس جماعت نے کبھی کسی سے سودے بازی کی ہو، یا اس کے کسی آدمی نے کسی عہدہ و منصب کے لیے دوڑ دھوپ کی ہو، یا اس کا کوئی رکن اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا نظر آیا ہو جس میں دوسرے لوگ غوطے لگا رہے تھے کیا کسی صاحبِ ضمیر آدمی کے لیے جماعت کی یہ تاریخ اس بات کا یقین دلانے کو کافی نہیں ہے کہ اس کا اختلاف اغراض پر نہیں بلکہ ایمانداری پر مبنی ہے؛

دنیا میں جہاں کہیں بھی برسرِ اقتدار طبقہ حزبِ اختلاف سے نمٹنے کے لیے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتا ہے اس سے لوگوں کو اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا موقف اخلاقی اعتبار سے کمزور ہے۔ یہ طریقہ اقتدار کو مضبوط کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ اس کو ضعف پہنچانے کا موجب ہوتا ہے۔ اقتدار کے لیے مضبوط ترین بنیاد اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ لوگوں کو اس کے موقف کی صحت کا اطمینان ہو۔ اس اطمینان کو متزلزل کر دینے کے بعد اہلِ اقتدار مجبور ہو جاتے ہیں کہ انتظامیہ کی طاقت پر انحصار کریں اور دلوں پر حکومت کرنے کے بجائے صرف جسموں کو تابع بنا کر رکھیں۔

ہمارے ملک میں جو چیز آج تک جمہوریت کے صحیح نشوونما میں حائل رہی ہے وہ اصحابِ اقتدار کی یہی غیر دانشمندانہ روش ہے۔ جب بھی کوئی گروہ برسرِ اقتدار آیا اور اس نے اپنے ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل کی وجہ سے عوام میں اپنی مقبولیت کھونا شروع کی تو اس نے اپنی روش میں اصلاح کرنے کی بجائے انتظامیہ کو براہِ راست اپنی امداد پر ابھارا اور اس کی طاقت کو اپنے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس طریقِ کار سے برسرِ اقتدار طبقوں کو جو فائدہ حاصل ہوا وہ تو الگ بحث ہے، جس میں ہم اس وقت پڑنا نہیں چاہتے۔ البتہ ایک چیز بالکل واضح ہے کہ اس قسم کی غلط تدبیروں سے آج انتظامیہ ملک کی خادم بننے کی بجائے اس کی غیر مسئول قوتِ حاکمہ بن گئی ہے۔ یہ طبقہ جس طرح

چاہتا ہے من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ اس کے ہاتھوں لوگوں کے ساتھ طرح طرح کی بے انصافیاں ہورہی ہیں، اور حکومت کے جو فیصلے بھی اس نوکر شاہی طبقہ کے مزاج اور مفاد کے خلاف ہوتے ہیں، وہ نافذ نہیں ہونے پاتے۔ ایسے ہی حالات ہوتے ہیں جن میں عوام یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اُن کی رائے اُن کے اپنے ملک میں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتی بلکہ اصل قدر انہی لوگوں کی ہے جو حکومت کی انتظامی مشنری پر کسی نہ کسی حیثیت سے قابض ہوگئے ہیں۔ اس سے لوگوں کے اندر افسردگی اور ملکی معاملات سے عدم دلچسپی پیدا ہو جانا ایک فطری بات ہے اور یہ عوارض قومی زندگی کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں نوکر شاہی کے بڑھے ہوئے حوصلے ایک اور وجہ سے بھی انتہائی تشویشناک ہیں۔ اس خطہ پر ۱۶۰ برس بیشتر ایک ایسی قوم حکومت کر رہی تھی جو افکار و نظریات، احساسات و جذبات اور اطوار و عادات کے اعتبار سے ہم سے بالکل مختلف تھی۔ اس قوم کو ہم سے بجز اس کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ہم اس کے کارخانوں کے لیے خام مال مہیا کریں اور پھر جو مال وہاں تیار ہو اس کی کئی گنی قیمت ادا کر کے اسے دنیاوی اعتبار سے فارغ البال کر دیں۔ اس بنا پر یہ قوم ہمیں انسان سمجھ کر ہم سے انسانوں جیسا برتاؤ نہ کرتی تھی بلکہ ہمیں جانوروں سے بھی بدتر مخلوق خیال کر کے ہم سے بڑا ظالمانہ سلوک روا رکھتی تھی۔ پھر وہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس ملک پر قبضہ کرنے اور اس کی دولت کو اندھا دھند لوٹنے کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں، اس لیے وہ ڈاکوؤں کی سی ذہنیت کے ساتھ صرف تشدد کے ذریعہ اپنے کام نکالتی تھی۔ اسے یہ معلوم تھا کہ جب بھی اہل ملک کا شعور بیدار ہوگا، اسے اس خطّے کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اس بنا پر اسے اس بات کی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کسی طرح لوگوں کے اندر بیداری نہ پیدا ہونے پائے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے اُس نے وہ سارے شرمناک حربے استعمال کیے جو استعمار پسند قومیں عام طور پر کرتی ہیں۔ اس نے سب سے پہلے اس امر کا التزام کیا کہ انتظامیہ

کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپے جائیں تاکہ اس کی مدد سے مخالفین کو اچھی طرح دبایا جاسکے اور اسے عوام کی گردنوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ وہ بھیڑوں کا ایک گلہ بن جائیں جنہیں اقتدار کی لاٹھی جس طرف چاہے میکانکی طور پر ہانک کرلے جائے۔

اس "کارِ خیر" کو کامیابی کے ساتھ سر انجام دینے کے لیے انتظامیہ کو خاص تربیت دی گئی اور انہیں قومی و ملی احساسات سے بیگانہ کیا گیا تاکہ کسی آزمائش کے وقت اُن کے ہاتھوں میں کوئی لرزش نہ پیدا ہونے پائے اور وہ بے حس مشینوں کی طرح اپنی ہی قوم کو دبانے کی خدمت انجام دینے پر ہر وقت آمادہ رہیں۔

اسے ہماری بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہماری انتظامیہ کو انگریز کی تربیت یافتہ انتظامیہ سے ترکہ میں بہت سی روایات ملی ہیں۔ اس کے اندر درشتی، تکبّر اور نخوت کے جذبات کی وہی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جن کے مظاہرے ہم انگریزی عہد میں بالعموم دیکھتے تھے۔ عوامی احساسات سے اس کے تغافل میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ اس صورتِ حال میں عوام اگر مایوس نہ ہوں تو اور کیا کریں۔ برسرِ اقتدار طبقے بیشک یہ پروپیگنڈا کرتے رہیں کہ مایوسی کی یہ لہر کسی "اقتدار کی خواہاں" جماعت نے دوڑائی ہے۔ لیکن عوام اصل حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان بیچاروں کو جن ٹھوس واقعات اور تلخ حقائق سے دن رات سابقہ پیش آتا ہے وہ اس سے آخر کس طرح صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ وہ انتظامیہ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے ہیں اور ان کے اندر یہ حوصلہ شکن احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ ملک کے معاملات کا فیصلہ اب اُن کے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ ایک ایسے مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو ان کے احساسات و جذبات سے یکسر بیگانہ اور اُن کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھنے سے عاجز ہے۔

جماعت اسلامی اور اس کے امیر کے خلاف پروپیگنڈے کا جو خوفناک طوفان اس وقت اٹھایا جا رہا ہے وہ افسوسناک ہونے کے علاوہ بڑا عبرتناک بھی ہے۔ اسے دیکھ کر انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ چڑ

اور ضد کے جذبات میں بہک کر لوگ کس سطح تک اُتر جاتے ہیں اور غیظ و غضب ان کے دماغی توازن کو کس حد تک بگاڑ دیتا ہے۔ پراپیگنڈے کی اس مہم میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف بعض ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جن سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے بلکہ انہوں نے انہیں مٹانے کے لیے سر توڑ کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں کا ایک ایک حرف اور اُن کی تقریروں کا ہر لفظ بلکہ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ انہیں ان چیزوں سے کتنی نفرت ہے اور وہ ملک و قوم کے لیے انہیں کتنا نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ان چیزوں میں شاید سرفہرست "طاقت کے ذریعہ اقتدار کی تبدیلی ہے"۔ وزیر داخلہ صاحب نے الزام لگایا ہے کہ مولانا قوت کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں

وہ شخص جس نے مولانا کی تحریروں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے یا جو اُن کے طرز فکر سے بالکل سرسری واقفیت بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ چیز مولانا کے مزاج سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ انہوں نے سیاسی تبدیلی کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کی ہمیشہ مذمّت کی ہے اور لوگوں کو اس بات کا قائل کیا ہے کہ اس قسم کی مصنوعی تبدیلیوں سے ملک کے اندر کوئی خوشگوار انقلاب نہیں آسکتا۔ اسے زمانے کی ستم ظریفی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قوت کے ذریعہ سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ ہی اب اُلٹا مولانا پر یہ الزام لگانے کی جسارت کر رہے ہیں

نوابزادہ لیاقت علی خاں کے قتل پر مولانا محترم نے جن احساسات کا اظہار فرمایا تھا اس میں انہوں نے اس رجحان کی بڑی سختی سے مخالفت کی اور بتایا کہ اگر کوئی قوم عقل و فکر سے یکسر عاری نہیں ہو چکی تو وہ سیاسی تبدیلی کے لیے قوت کبھی استعمال نہیں کرتی۔ اسی موضوع پر وہ بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "یہ واقعہ اس لحاظ سے خطرناک بھی ہے کہ یہ اس ملک میں ایک بہت بڑے رجحان کے اُبھرنے کی علامت ہے۔ اگرچہ سردست یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حرکت کا محرک کیا تھا۔ کوئی مذہبی محرک تھا یا شخصی۔ لیکن اگر فی الواقع وہ کوئی سیاسی محرک تھا تو یقیناً یہ حالات کو ایک ایسے رُخ کی طرف موڑنے والی حرکت ہے جس کی ہر اُس شخص کو مذمت کرنی چاہیے جو اس ملک اور اس

ملت کی فلاح چاہتا ہو۔کسی ملک کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی بدقسمتی نہیں ہو سکتی کہ اس میں فیصلے کا آخری اختیار عقل، شعور، دلیل اور رائے عامہ سے چھین کر قاضی شمشیر کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ قاضی کوئی عادل اور صاحب فکر قاضی نہیں ہے یہ اندھا، بہرا اور گونگا قاضی ہے۔اس سے جب کبھی فیصلہ چاہا گیا ہے، اس نے حق اور انصاف دیکھ کر نہیں بلکہ خون کی رشوت لیکر فیصلہ کیا ہے، اور جس نے بھی زیادہ خون چڑھا دیا ہے اُسی کے حق میں اُس نے فیصلہ دے دیا ہے، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔کوئی قوم جو خود اپنی دشمن نہ ہو اور جس کی عقل کا دیوالہ نہ نکل چکا ہو، ایسی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شعور و استدلال کے بجائے تلوار کے اندھے اور رشوت خوار قاضی کے حوالہ کر دے۔

اگر ہم اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں پوری طاقت کے ساتھ اپنے ملک کے حالات کو اس خطرناک رُخ پر جانے سے روکنا چاہیے۔"

(ہمارے داخلی اور خارجی مسائل مطبوعہ ۱۹۵۱ء ص ۲)

اسی سلسلہ میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی ایک قرارداد بھی ملاحظہ فرمائیں جو اس نے ستمبر ۱۹۴۸ء میں طریق کار متعین کرتے ہوئے پاس کی تھی:

"اپنے اس مقصد کے لیے یہ جماعت ایسے ذرائع اور طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھتی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں، یا جن سے بدنظمی اور بدامنی رونما ہو۔ وہ اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری طریقوں پر یقین رکھتی ہے، یعنی تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اذہان اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو ہمارے پیشِ نظر ہیں۔جماعت کا کوئی کام خفیہ نہیں ہے بلکہ سب کچھ علانیہ ہے۔جن قوانین پر ملک کا نظم و نسق اس وقت چل رہا ہے ان کو وہ توڑنا نہیں چاہتی بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق بدلنا چاہتی ہے۔جو لوگ ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں

انہیں ہٹانا یا خود ان کی جگہ لینا اس کے پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ وہ انہیں ہم خیال بنانا چاہتی ہے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کریں تو پھر جمہوری طریقوں پر انہیں ایسے لوگوں سے بدلنا چاہتی ہے جو اصلاح یافتہ رائے عام کے نزدیک صالح ہوں۔"

انہی اصولوں کو اُس دستور میں شامل کیا گیا جو ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی کی مجلسِ دستور ساز نے مرتب کیا تھا۔ اور یہ اصول جُوں کے توں اس ترمیم شدہ دستور میں بھی موجود ہیں جو ۱۹۵۷ء میں بنایا گیا تھا اور جس پر اس وقت جماعت کام کر رہی ہے (ملاحظہ ہو دستور جماعت ۱۹۵۲ء، دفعہ ۱۰۔ اور دستور جماعت ۱۹۵۷ء۔ دفعہ ۵)

محولہ بالا تصریحات کو بار بار پڑھیے اور پھر خود اندازہ لگائیے کہ جو لوگ مولانا اور جماعت اسلامی پر سیاسی تبدیلی کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کا الزام لگا رہے ہیں وہ اپنے پاس حق پرستی اور انصاف پسندی کا کتنا سرمایہ رکھتے ہیں۔ پھر یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان اقتباسات میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انہیں تحریکِ اسلامی کے وسیع لٹریچر کے کسی مستور گوشے سے اٹھا کر وقتی ضرورت کے پیشِ نظر اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ وہ عام خیالات ہیں جن کی جھلکیاں اس کے پورے ادب میں دیکھی جا سکتی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آئینی و جمہوری ذرائع کے استعمال سے تبدیلی کی امنگ جماعت کے مزاج کا ایک نہایت ضروری حصہ ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔

جماعت اسلامی تو اپنے ہی ملک میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی کام کرنے والے نوجوانوں کو مسلسل یہ تلقین کر رہی ہے کہ وہ مسلح انقلاب اور زیرِ زمین تحریکوں کو چھوڑ کر کھلے میدان میں آئینی و جمہوری طریقوں سے اصلاحِ احوال کی جدوجہد کریں۔ چنانچہ گذشتہ حج کے موقع پر اسلامی ممالک کے نوجوانوں کے ایک اجتماع میں امیرِ جماعت نے جو تقریر کی وہ اُن کے طرزِ فکر کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور

اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعہ سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے۔ بڑے پیمانہ پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے۔ اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے۔ اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے۔ جلد بازی سے کام لیکر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا۔"

(ترجمان القرآن ماہ جون ۶۳ء جلد ۶۰ عدد ۳)

اس سلسلہ میں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا محترم کی جن تحریروں سے آج یہ نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ وہ سیاسی تبدیلی کے لیے طاقت استعمال کرنے کے قائل ہیں ان میں سے کوئی تحریر بھی نئی نہیں ہے۔ الجہاد فی الاسلام پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اور اب تک اس کے چار ایڈیشن کئی ہزار کی تعداد میں نکل چکے ہیں۔ اسی طرح خطبات جس کے آخری دو خطبے جہاد پر ہیں، ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور اب تک اس کے اتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں کہ اس کتاب کی اگر مجموعی اشاعت کا اندازہ لگایا جائے تو وہ کسی طرح بھی ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ پھر اس کے آخری دونوں خطبے "حقیقتِ جہاد" کے نام سے بھی الگ شائع ہوئے ہیں۔ اور اس پمفلٹ کی اشاعت بھی ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق مولانا کی یہ دو کتابیں اس وقت کم از کم دو لاکھ گھروں میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان خطبات کو ملک کی ہزاروں مساجد میں پورے التزام کے ساتھ سنایا گیا ہے اور لاکھوں افراد نے انہیں سنا ہے۔ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد میں آج تک کسی ایک کے ذہنِ رسا نے بھی ان سے وہ معانی اخذ

نہیں کیے جو آج وزیر داخلہ صاحب اخذ کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مطلب اب تک صرف دو گروہوں نے اخذ کیا ہے۔ ایک قادیانی، دوسرے منکرینِ حدیث۔ اس پر الفضل اور طلوعِ اسلام کے صفحات شاہد ہیں۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں گروہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی عداوت میں کس قدر اندھے ہو چکے ہیں اور اس عداوت کی اصل وجہ کیا ہے۔ وزیر صاحب کو زبان کھولنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ مولانا محترم کی یہ تحریریں کہیں انبار خانوں میں دبی ہوئی تو نہیں ہیں۔ یہ بے شمار لوگوں کے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ وہ جب اپنے ملک کی ایک ذمہ دار شخصیت کی زبان سے ایسی باتیں سنیں گے تو ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

ہم اس ملک کے پڑھے لکھے اور سنجیدہ طبقہ کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ براہ کرم الجہاد فی الاسلام کے دو ابواب یعنی باب سوم "مصلحانہ جنگ" اور باب چہارم "اشاعتِ اسلام اور تلوار" اور اسی طرح "خطبات" کے آخری دو خطبے "جہاد" اور "جہاد کی اہمیت" کا خود غیر جانبدارانہ مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا واقعی ان سے وہی نتائج نکلتے ہیں جن کی طرف وزیر صاحب بار بار اشارہ کر رہے ہیں۔

ہم یہ بات کسی فخر و مباہات کے جذبے سے نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ ہم نے آج تک کبھی بھی کوئی فیصلہ اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا بلکہ ہر قدم خدا اور رسولؐ کے احکام کے تحت اسلام اور امتِ مسلمہ کے مجموعی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر اٹھایا ہے۔ تقسیم ملک کی جدوجہد کے معاملہ میں ہم نے جو رویہ اختیار کیا تھا اُس میں بھی ہمارے سامنے صرف اُمّت کی بھلائی ہی تھی۔ اس میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی۔ ہمارے اس رویّے کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل امور کو نگاہ میں رکھنا چاہیے:

— سیاسی کشمکش حصّہ سوم کے مضامین جن کا حوالہ آج دیا جا رہا ہے، ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں لکھے گئے تھے جبکہ ابھی یہ مسئلہ طلب تھا کہ ہندوستان قبل تقسیم کے متحدہ ہندوستان میں اسلام

اور مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی کیا صورت ہے۔ اس کتاب کے مصنف کی نگاہ میں اس کی جو صحیح ترین اور مناسب ترین صورت تھی اسے انہوں نے دلائل کے ساتھ پیش کیا، اور یہ بتایا کہ دوسری جو صورتیں تجویز کی جارہی ہیں ان میں کیا قباحتیں ہیں اور ان کے کیا نتائج ہونگے۔

——— مسلم لیگ نے جب ۱۹۴۰ء میں اپنا مشہور ریزولیشن پاس کیا جس میں پاکستان کو مسلمانوں کا قومی نصب العین قرار دیا گیا تھا، اس وقت کسی سے بھی یہ امر پوشیدہ نہ تھا، اور بہت سے دردمند مسلمان رہنما اسے محسوس کر رہے تھے کہ یہ صرف آدھی قوم کے مسئلے کا حل ہے۔ بقیہ آدھی قوم جو ہندوستان کے بڑے حصے میں ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے وہ اسی تنگ دل اور متعصب اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ بلکہ الگ وطن بن جانے کے بعد اس کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہو جائے گی۔

——— برطانوی ہند کے سیاسی حالات ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جس نہج پر جارہے تھے انہوں نے یہاں کافی حد تک بے یقینی کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ انگریز آخری وقت تک تقسیم ملک سے انکار کرتا رہا اور پوری مسلم قوم کے ساتھ "آنکھ مچولی" کھیلتا رہا۔ ادھر مسلم قوم کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی اُن میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہیں صرف مفادات نے مسلم لیگ سے وابستہ کر دیا تھا۔ قائد اعظم پر ان لوگوں کے خلوص کی حقیقت پوری طرح واضح تھی، اس لیے وہ کوئی سخت قدم اٹھانے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے اور اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی معقول حل اگر تقسیم ملک علاوہ بھی سامنے آجائے تو اُسے مان لیا جائے۔ غالباً اسی جذبہ کے تحت انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کرنا گوارا کیا۔ اگر کانگرس اس معاملے میں بدعہدی نہ کرتی تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔

——— اس کے علاوہ کسی چشم بینا سے یہ حقیقت بھی اوجھل نہ تھی کہ پاکستانی تحریک جس انداز سے چلائی جارہی تھی اور جن لوگوں کے ہاتھوں چل رہی تھی اُس سے ایک قومی ریاست کا قیام تو ممکن تھا لیکن اس سے آگے کی مہم یعنی اس کو اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا، جس کی آرزو میں مسلمان من حیث القوم

اس تحریک میں شامل ہوئے تھے اس تحریک اور ان لیڈروں اور کارکنوں کے بس کا کام نہ تھا۔
ہماری ملی زندگی میں یہ دو خلا تھے جنہیں پر کرنا ازبس ضروری تھا۔ اگر انہیں پر کرنے کے لیے کوئی متوازی اسلامی تحریک نہ اٹھائی جاتی تو آج اس برعظیم میں مسلمان شدید مایوسی کا شکار ہوتے۔ اس وقت جبکہ پروپگنڈا کا طوفان ہر طرف سے اٹھایا جا رہا ہے ممکن ہے عوام اس کی افادیت کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ لوگوں کے اندر اس امر کا شعور پیدا ہوگا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کو کتنا زبردست سہارا دیا ہے۔

آپ خود سوچیے۔ کیا تقسیم کے بعد مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی پناہ گاہ بن سکتی تھی؟ اور کیا وہ بن سکی؟ یہ اسی دوسری متوازی تحریک ہی کا اعجاز ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت کو جان گئے کہ ان کی طاقت کا مدار تعداد پر نہیں بلکہ ان لاثانی اصولوں پر ہے جن کی وجہ سے انہیں امتِ وسطٰی کہا گیا ہے۔ اس سرزمین میں اپنی اسلامی انفرادیت کو بچانے اور اسلام کی شمع روشن رکھنے میں پوری طرح مصروفِ عمل ہیں۔ یہ تحریک اگر اس آڑے وقت میں انہیں رجوع الی اللہ کے لیے آمادہ نہ کرتی تو وہ لوگ بالکل ہمت ہار چکے تھے۔ ذرا ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کیجیے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ دونوں وہاں کے مسلمانوں کے لیے بے کار ثابت ہوئی ہیں۔

پھر ذرا اس بات پر بھی غور کیجیے کہ اگر مسلم لیگ تقسیم ملک کے لیے اپنا پورا زور لگا دینے کے بعد بھی خدانخواستہ اس کوشش میں ناکام ہو جاتی تو ان حالات میں کیا وہ مسلمان قوم کے احساس شکست کا کوئی مداوا کر سکتی تھی؟ کیا دنیا میں کوئی مثال اس کی موجود ہے کہ ایک جماعت لڑ کر ہار جانے کے بعد پھر کھڑی رہ سکے؟ اس حالت میں کیا احتیاط کا تقاضا یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک دوسرا خط مدافعت (SECOND LINE OF ACTION) اور ایک محفوظ طاقت (RESERVE FORCE) ایسی مہیا رہے جو آگے کی صفوں کے شکست کھا جانے کی صورت میں قوم کو سنبھالنے کے قابل ہو؟ آج آپ فتح حاصل ہو جانے کے ۱۴ سال بعد باتیں بنا رہے ہیں۔ مگر ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جو حالات تھے انہیں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ۱۹۴۷ء کے ابتدائی دور تک ملک کا تقسیم ہو جانا یقینی نہ تھا اور ناکامی کے امکانات خارج از بحث نہ ہو سکے تھے۔

اُس وقت جس شخص نے پانچ چھ سو مخلص کارکنوں کا ایک مختصر سا گروہ اس غرض کے لیے منظم کیا کہ اگر خدا نخواستہ اس جنگ میں مسلم لیگ ناکام ہو گئی تو یہ گروہ مسلمانوں کو سنبھالنے کی خدمت انجام دے سکے۔ اور اس گروہ کو جنگ سے الگ رکھا تاکہ اس کے لیے کام کرنا ممکن ہو، کیا اس نے یہ اپنی قوم کے ساتھ کوئی بُرائی کی تھی؟ یہ دُوراندیشی مذمت کی مستحق ہے یا اعتراف کی؟

پھر مسلم لیگ نے تقسیم ملک کا مرحلہ تو بلا شبہ طے کر لیا اور اس کی کامیابی اسی کی کوششوں کی رہینِ منت ہے، ہم اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا لیگ پاکستان میں مسلم قوم کی اُن آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لیے بھی کچھ کر سکی جن کی خاطر ہی اس قوم نے خاک و خون کے سمندر میں سے گزرنا گوارا کیا تھا؟ راجہ محمود آباد کی قماش کے لوگ آج جو چاہیں کہتے رہیں، لیکن یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن اور دن کے اُجالے سے زیادہ واضح ہے کہ ہندی مسلمانوں نے ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ خواہ زندہ رہیں یا مریں لیکن یہاں ایک اسلام کی تجربہ گاہ ضرور قائم ہو جائے۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ اس نصب العین کی بے حرمتی میں جو ہاتھ شامل ہیں اُن میں کتنی تعداد اُن ہاتھوں کی ہے جنہوں نے کبھی مسلم لیگ کے پرچم کو سنبھال رکھا تھا اور جن کی قیادت میں کبھی "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللّٰہ" کے فلک شگاف نعرے لگا کرتے تھے۔ یہ درحقیقت کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ تقسیم سے برسوں پہلے اس کے آثار نظر آ رہے تھے اور کوئی دُوراندیش آدمی یہ دیکھ رہا تھا کہ ان ہاتھوں سے جو ریاست قائم ہو گی اس میں اسلام کے متعلق ان وعدوں کا کیا حشر ہو گا۔ اس نے آگے کے ان حالات کا محض پیشگی اندازہ ہی نہیں کیا بلکہ صاف صاف لکھ بھی دیا کہ ان کی بنائی ہوئی ریاست کے رنگ ڈھنگ کیا ہوں گے، اور آج ہر ایماندار آدمی دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ لفظاً بلفظاً صحیح ثابت ہوا۔ اب اگر اُسی دُوراندیش انسان نے یہ وقت آنے سے برسوں پہلے ایک تربیت یافتہ منظم جماعت اس غرض کے لیے تیار کرنی شروع کر دی کہ اسلام سے جب یہ فرار ہونے لگے تو وہ جماعت غلط کار ہاتھوں کو روکنے کے قابل ہو تو کیا اس نے اپنی قوم اور اپنے دین کے ساتھ یہ کوئی بے وفائی کی تھی؟ اس کے اس کام پر اُن لوگوں کا غصہ تو سمجھ میں آ سکتا ہے جن کی غلط کاریوں کے راستے میں یہ شخص اور جماعت مزاحم ہے؟ مگر کیا اس خدمت پر وہ

مسلمان قوم کی ناراضی کے بھی مستحق ہیں؟

جو لوگ آج مولانا مودودی پر پاکستان دشمنی کے الزامات لگا رہے ہیں وہ خود آج سے چند سال پیشتر پاکستان کے کتنے حامی اور خیرخواہ تھے اور انہیں ملت کا کتنا درد تھا، اور اس کی خدمت کے لیے انہوں نے کتنی قربانیاں دیں، اُن کا حال پوری قوم جانتی ہے۔ اس لیے ہم اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اس امر کی وضاحت کے لیے کہ بیس بیس پچیس پچیس سال پہلے کی تحریروں کو ان کے تاریخی پس منظر اور اس زمانے کے حالات سے قطع نظر کر کے کھنگالنا کس قدر غلط ہے، ہم اسی دور کی تاریخ کا ایک اور باب بھی سامنے لا کر رکھتے ہیں تاکہ ہر معقول آدمی سمجھ سکے کہ پرانی چیزوں سے اُلٹے سیدھے نتائج نکالنے پر اگر کوئی اُتر آئے تو کس کا دامن بچا رہ پائے گا۔ یہ باب ہماری ملت کی دو نہایت محترم شخصیتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں بزرگ ہر طبقے میں انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی خدمات اور بے لوثی کا سب کو اعتراف ہے۔ اُن کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خدانخواستہ اُن کی تذلیل کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ہمیں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک دور کے حالات دو مخلص اصحابِ فکر کو کس طرح دو مختلف نتائج تک لے جاتے ہیں اور وہ شخص کیسی سخت غلطی کرے گا جو حالات کے پس منظر کو اور ان اصحاب کے نقطۂ نظر کو سمجھے بغیر اُن میں سے کسی ایک کو برسرِ غلط ٹھیرانے اور کسی کے اخلاص پر شبہ کرنے کی جسارت کرے۔

ان شخصیتوں میں سے پہلی شخصیت ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ہے۔ مسلم لیگ اور قائداعظم سے انہیں جو قلبی لگاؤ تھا اُس کے بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ڈاکٹر صاحب نے لیگ اور قائداعظم دونوں کی مخالفت کی۔ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور ڈاکٹر اقبال کے دیرینہ نیازمند ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں اس کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"تحریکِ عدمِ تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قربِ مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب جناح لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے سکرٹری بھی بن گئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لیے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرضِ وجود میں آئی تو ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ پہلے وہ اس کی مجلسِ عاملہ کے ممبر اور پھر اس کے صدر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو جو راقم التحریر کے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں ۱۹۲۷-۲۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سکرٹری اور مسٹر جناح کے دستِ راست تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ "جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے ان تینوں ترمیموں کو بیدردی سے رد کر دیا جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آ چکا تھا۔ اُدھر کانگریس نے یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کے رویے پر سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو الجھن پیدا کر دی ہے جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں مصالحت نہیں ہو سکتی" (ص ۳۰۸ - ۳۰۹)

اب ذرا سوچیے کہ آج اگر کوئی شخص صرف اس اقتباس کو سامنے رکھ کر یہ کہنا شروع کر دے کہ ڈاکٹر اقبال مسلم ملت کے بدخواہ اور قائدِ اعظم کے مخالف تھے، یا قائدِ اعظم نے کسی وقت مسلم ملت کو

(باقی ص ۲۰۲ پر)

تفہیم القرآن

الزمر

نام | اس سورہ کا نام آیات نمبر ۱، و ۳۷ (وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا اور وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا) سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں لفظ زمر آیا ہے۔

زمانۂ نزول | آیت نمبر ۱۰ (وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ) سے اس امر کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرت حبشہ سے پہلے نازل ہوئی تھی بعض روایات میں یہ تصریح آئی ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کے حق میں ہوا تھا جبکہ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کا عزم کیا (روح المعانی، جلد ۲۳، صفحہ ۲۲۶)

موضوع اور مضمون | یہ پوری سورت ایک بہترین اور انتہائی مؤثر خطبہ ہے جو ہجرت حبشہ سے کچھ پہلے مکہ معظمہ کی ظلم و تشدد سے بھری ہوئی اور عناد و مخالفت سے لبریز فضا میں دیا گیا تھا۔ یہ ایک وعظ ہے جس کے مخاطب زیادہ تر کفارِ قریش ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں اہلِ ایمان سے بھی خطاب کیا گیا ہے۔ اس میں دعوتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اصل مقصود بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان خالص اللہ کی بندگی اختیار کرے اور کسی دوسرے کی طاعت و عبادت سے اپنی خدا پرستی کو آلودہ نہ کرے۔ اس اصل الاصول کو بار بار مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے نہایت زوردار طریقے پر توحید کی حقانیت اور اسے ماننے کے عمدہ نتائج، اور شرک کی غلطی اور اس پر جمے رہنے کے بُرے نتائج کو واضح کیا گیا ہے، اور لوگوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آکر اپنے رب کی رحمت کی طرف

پلٹ آئیں۔ اِسی سلسلے میں اہلِ ایمان کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہو گئی ہے تو اُس کی زمین وسیع ہے۔ اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو، اللہ تمہارے صبر کا اجر دے گا۔ دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ان کفار کو اس طرف سے بالکل مایوس کردو کہ ان کا ظلم وستم کبھی تم کو اس راہ سے پھیر سکے گا اور اُن سے صاف صاف کہہ دو کہ تم میرا راستہ روکنے کے لیے جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو کر ڈالو، میں اپنا یہ کام جاری رکھوں گا۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے[1]۔

(اے محمدؐ)، یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے[2]، لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے[3]۔ خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے[4]۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے

---

[1] یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے جس میں بس یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام نہیں ہے، جیسا کہ منکرین کہتے ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے خود نازل فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر کر کے سامعین کو دو حقیقتوں پر متنبہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اس کلام کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں بلکہ اس کی اہمیت محسوس کریں۔ ایک یہ کہ جس خدا نے اسے نازل کیا ہے وہ عزیز ہے یعنی ایسا زبردست ہے کہ اس کے ارادوں اور فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی مزاحمت کر سکے۔ دوسرے یہ کہ وہ حکیم ہے یعنی جو ہدایت وہ اس کتاب میں دے رہا ہے وہ سراسر دانائی پر مبنی ہے اور صرف ایک جاہل و نادان آدمی ہی اس سے منہ موڑ سکتا ہے۔

[2] یعنی اس میں جو کچھ ہے حق اور سچائی ہے، باطل کی کوئی آمیزش اس میں نہیں ہے۔

[3] یہ ایک نہایت اہم آیت ہے جس میں دعوتِ اسلام کے اصل مقصود کو بیان کیا گیا ہے اس لیے

اس پر سے سرسری طور پر نہ گزر جانا چاہیے ۔ بلکہ اس کے مفہوم و مدعا کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ اس کے بنیادی نکات دو ہیں جنہیں سمجھے بغیر آیت کا مطلب نہیں سمجھا سکتا ۔ ایک یہ کہ مطالبہ اللہ کی عبادت کرنے کا ہے ۔ دوسرے یہ کہ ایسی عبادت کا مطالبہ ہے جو دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے کی جائے ۔

عبادت کا مادہ عبد ہے ۔ اور یہ لفظ "آزاد" کے مقابلے میں "غلام" اور "مملوک" کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے ۔ اسی معنی کے لحاظ سے "عبادت" میں دو مفہوم پیدا ہوئے ہیں ۔ ایک، پوجا اور پرستش، جیسا کہ عربی زبان کی مشہور و مستند لغت "لسان العرب" میں ہے، عَبَدَ اللہ : تَأَلَّہَ لَہٗ ۔ وَالتَّعَبُّدُ : التَّنَسُّکُ ۔ دوسرے، عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرمانبرداری، جیسا کہ لسان العرب میں ہے، العبادۃ : الطاعۃ ۔ ومعنی العبادۃ فی اللغۃ الطاعۃ مع الخضوع ۔ وکل من دان لملک فھو عابد لہ (وَقَوْمُھُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ) ۔ والعابد : الخاضعُ لربہ المستسلمُ المنقادُ لامرہ ۔ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ : اطاعہ یعنی الشیطان فیما سَوَّل لہ واغواہ ۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ : ای نطیع الطاعۃ التی یخضع معھا ۔ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ : اطیعوا ربکم ۔ اہل لغت کی ان مستند تشریحات کے مطابق مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کی پوجا اور پرستش ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت، اور اس کے قانونِ شرعی کی برضا و رغبت پیروی ۔ اور اس کے امر و نہی کی دل و جان سے فرمانبرداری کا بھی ہے ۔

دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے :

(۱) ایک مفہوم ہے غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرف، سیاست و فرمانروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا ۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے دَانَ النَّاسَ : ای قھرھم علی الطاعۃ ۔ دِنْتُھُم : ای قھرتُھم ۔ دِنْتُہ : سُسْتُہ و ملکتُہ ۔ وفی الحدیث الکیّس من دان نفسہ ۔ ای اذلّھا و استعبدھا ۔ الدّیّان : القاضی، الحَکَم، القھّار ۔ ولا انت دیّانی : ای لست بقاھرٍ لی فتسُوس امری ۔ مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ : ای فی قضاء الملک ۔

(۲) دین کا دوسرا مفہوم ہے اطاعت، فرمانبرداری اور غلامی ۔ لسان العرب میں ہے الدین،

اُس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اِس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی

الطاعة - دِنْتُهُ و دِنْتُ لَهُ، ای اطعتُهُ - والدین للہ، انما ھو طاعتہ والتعبد لہ - فی الحدیث أریدُ من قریشٍ کلمۃ تَدِین لہم بہا العرب، ای تطیعہم و تخضع لہم - ثم دانت بعد الرِّباب ای ذلّت لہ واطاعتہُ - یمرقون من الدین، ای انہم یخرجون من طاعۃ الامام المفترض الطاعۃ - المدین، العبد - فَلَوْلَا اِنْ کُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ، ای غیر مملوکین -

(۳) تیسرا مفہوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے - لسان العرب میں ہے

الدین، العادۃ والشأن - یقال ما زال ذالک دینی و دیدنی، ای عادتی -

ان تینوں مفہومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنی اِس آیت میں اُس "طرزِ عمل اور اس رویّے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے"۔ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ "آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے"۔

۵ یہ ایک امرِ واقعہ اور ایک حقیقت ہے جسے اِس مطالبے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کر کے اُس کی بندگی تم کو کرنی چاہیے کیونکہ خالص اور بے آمیز اطاعت و بندگی اللہ کا حق ہے۔ دوسرے الفاظ میں، بندگی کا مستحق کوئی دوسرا ہے ہی نہیں کہ اللہ کے ساتھ اُس کی بھی پرستش اور اُس کے احکام و قوانین کی بھی اطاعت کی جائے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی خالص اور بے آمیز بندگی کرتا ہے تو غلط کرتا ہے۔ اور اسی طرح اگر وہ اللہ کی بندگی کے ساتھ بندگیِ غیر کی آمیزش کرتا ہے تو یہ بھی حق کے سراسر خلاف ہے۔ اس آیت کی بہترین تشریح وہ حدیث ہے جو ابن مَردُویہ نے یزید الرقاشی سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، ہم اپنا مال دیتے ہیں اس لیے کہ ہمارا نام بلند ہو، کیا اس پر ہمیں کوئی اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ اس نے پوچھا اگر اللہ کے اجر اور دنیا کی ناموری دونوں کی نیت ہو؟ آپ نے فرمایا ان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا من اخلص لہ" اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اسی کے

عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں[۵]۔ اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُن تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں[۶]۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو[۷]۔

لیے نہ ہو۔ اس کے بعد حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

[۵] کفارِ مکہ کہتے تھے، اور بالعموم دنیا بھر کے مشرکین یہی کہتے ہیں کہ ہم دوسری ہستیوں کی عبادت اُن کو خالق سمجھتے ہوئے نہیں کرتے۔ خالق تو ہم اللہ ہی کو مانتے ہیں اور اصل معبود اسی کو سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی بارگاہ بہت اونچی ہے جس تک ہماری رسائی بھلا کہاں ہوسکتی ہے۔ اس لیے ہم ان بزرگ ہستیوں کو ذریعہ بناتے ہیں تاکہ یہ ہماری دعائیں اور التجائیں اللہ تک پہنچا دیں۔

[۶] یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اتفاق و اتحاد صرف توحید ہی میں ممکن ہے۔ شرک میں کوئی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے مشرکین کبھی اس پر متفق نہیں ہوئے ہیں کہ اللہ کے ہاں رسائی کا ذریعہ آخر کون سی ہستیاں ہیں۔ کسی کے نزدیک کچھ دیوتا اور دیویاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی سب دیوتاؤں اور دیویوں پر اتفاق نہیں ہے۔ کسی کے نزدیک چاند، سورج، مریخ، مشتری اس کا ذریعہ ہیں اور وہ بھی آپس میں اس پر متفق نہیں کہ ان میں سے کس کا کیا مرتبہ ہے اور کون اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ کسی کے نزدیک وفات یافتہ بزرگ ہستیاں اس کا ذریعہ ہیں اور ان کے درمیان بھی بے شمار اختلافات ہیں۔ کوئی کسی بزرگ کو مان رہا ہے اور کوئی کسی اور کو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن مختلف ہستیوں کے بارے میں یہ گمان نہ تو کسی علم پر مبنی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی ایسی فہرست آئی ہے کہ فلاں فلاں اشخاص ہمارے مقرب خاص ہیں، لہٰذا ہم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم ان کو ذریعہ بناؤ۔ یہ تو ایک ایسا عقیدہ ہے جو محض وہم اور اندھی عقیدت اور اسلاف کی بے سوچے سمجھے تقلید سے لوگوں میں پھیل گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ اس میں اختلاف تو ہونا ہی ہے۔

[۷] یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے دو الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ایک کاذب دوسرے کَفّار۔ کاذب ان کو اس لیے فرمایا گیا کہ انھوں نے اپنی طرف سے جھوٹ موٹ یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے اور

اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا برگزیدہ کر لیتا۔[۸] پاک ہے وہ اس سے (کہ کوئی اس کا بیٹا ہو)، وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب[۹]۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو

پھر بھی جھوٹ وہ دوسروں میں پھیلاتے ہیں۔ رہا کَفّار۔ تو اس کے دو معنی ہیں۔ ایک سخت منکرِ حق یعنی توحید کی تعلیم سامنے آجانے کے بعد بھی یہ لوگ اس غلط عقیدے پر مُصر ہیں۔ دوسرے۔ کافرِ نعمت یعنی نعمتیں تو یہ لوگ اللہ سے پا رہے ہیں اور شکریے اُن ہستیوں کے ادا کر رہے ہیں جن کے متعلق انہوں نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ نعمتیں ان کی مداخلت کے سبب سے مل رہی ہیں۔

۸۔ یعنی اللہ کا بیٹا ہونا تو سرے سے ہی ناممکن ہے ممکن اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی کو اللہ برگزیدہ کرے۔ اور برگزیدہ بھی جس کو وہ کرے گا، لامحالہ وہ مخلوق ہی میں سے کوئی ہوگا، کیونکہ اللہ کے سوا دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ مخلوق ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مخلوق خواہ کتنی ہی برگزیدہ ہو جائے، اولاد کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی، کیونکہ خالق اور مخلوق میں عظیم الشان جوہری فرق ہے، اور ولدیت لازماً والد اور اولاد میں جوہری اتحاد کی مقتضی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ "اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو ایسا کرتا" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ نے ایسا کرنا کبھی نہیں چاہا۔ اس طرز بیان سے یہ بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ کسی کو بیٹا بنا لینا تو درکنار، اللہ نے تو ایسا کرنے کا کبھی ارادہ بھی نہیں کیا ہے۔

۹۔ یہ دلائل ہیں جن سے عقیدۂ ولدیت کی تردید کی گئی ہے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص اور عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اولاد کی ضرورت ناقص و کمزور کو ہوا کرتی ہے۔ جو شخص فانی ہوتا ہے وہی اس کا محتاج ہوتا ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہو تا کہ اس کی نسل اور نوع باقی رہے۔ اور کسی کو متبنّٰی بھی وہی شخص بناتا ہے جو یا تو لاوارث ہونے کی وجہ سے کسی کو وارث بنانے کی حاجت محسوس کرتا ہے، یا محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر کسی کو بیٹا بنا لیتا ہے۔ یہ انسانی کمزوریاں اللہ کی طرف منسوب کرنا اور ان کی بنا پر مذہبی عقیدے بنا لینا جہالت اور کم نگاہی کے سوا اور کیا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ اکیلا اور اپنی ذات میں واحد ہے، کسی جنس کا فرد نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ

برحق پیدا کیا ہے[۱۰]۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخّر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو، وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے[۱۱]۔ اُسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر وہی ہے جس نے اُس جان سے اس کا جوڑا بنایا[۱۲]۔ اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے[۱۳]۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے[۱۴]۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے[۱۵]، بادشاہی اسی کی ہے[۱۶]، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے[۱۷]، پھر تم کدھر سے

اولاد لازماً ہم جنس ہُوا کرتی ہے۔ نیز اولاد کا کوئی تصوّر ازدواج کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور ازدواج بھی ہم جنس سے ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص سخت جاہل و نادان ہے جو اُس یکتا و یگانہ ہستی کے لیے اولاد تجویز کرتا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ وہ قہّار ہے۔ یعنی دنیا میں جو چیز بھی ہے اس سے مغلوب اور اس کی قاہرانہ گرفت میں جکڑی ہوئی ہے۔ اِس کائنات میں کوئی کسی درجے میں بھی اس سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا جس کی بنا پر اس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔

[۱۰] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۷۹ و ۵۲۵۔ جلد سوم صفحہ ۷۰۲۔

[۱۱] یعنی زبردست ایسا ہے کہ اگر وہ تمہیں عذاب دینا چاہے تو کوئی طاقت اس کی مزاحمت نہیں کر سکتی۔ مگر یہ اس کا کرم ہے کہ تم یہ کچھ گستاخیاں کر رہے ہو اور پھر وہ تم کو فوراً پکڑ نہیں لیتا بلکہ مہلت پہ مہلت دیئے جاتا ہے۔ اِس مقام پر عقوبت میں تعجیل نہ کرنے اور مہلت دینے کو مغفرت (درگزر) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[۱۲] یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے حضرت آدم سے انسانوں کو پیدا کر دیا اور پھر اُن کی بیوی حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ بلکہ یہاں کلام میں ترتیب زمان کے بجائے ترتیب بیان ہے جس کی مثالیں ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں تم نے آج جو کچھ کیا وہ مجھے معلوم ہے، پھر جو کچھ تم کل کر چکے ہو اُس سے بھی میں باخبر ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ کل کا واقعہ آج کے بعد ہُوا ہے۔

[۱۳] یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری میں سے ہر ایک کے چار چار نر و مادہ پیدا کیے۔

پھرائے جارہے ہو؟[۱۸]

---

[۱۴] تین پردوں سے مراد ہے پیٹ، رحم اور مَشِیمَہ (وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے)۔

[۱۵] یعنی مالک، حاکم اور پروردگار۔

[۱۶] یعنی تمام اختیارات کا مالک وہی ہے اور ساری کائنات میں اسی کا حکم چل رہا ہے۔

[۱۷] دوسرے الفاظ میں استدلال یہ ہے کہ جب وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی ساری بادشاہی ہے تو پھر لازماً تمہارا الٰہ (معبود) بھی وہی ہے۔ دوسرا کوئی الٰہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ نہ پروردگاری میں اس کا کوئی حصہ نہ بادشاہی میں اس کا کوئی دخل۔ آخر تمہاری عقل میں یہ بات کیسے سماتی ہے کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا تو ہو اللہ، سورج اور چاند کو مسخر کرنے والا اور رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات لانے والا بھی ہو اللہ، تمہارا اپنا اور تمام حیوانات کا خالق و رب بھی ہو اللہ، اور تمہارے معبود بن جائیں اس کے سوا دوسرے۔

[۱۸] یہ الفاظ قابل غور ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم کدھر پھرے جارہے ہو۔ ارشاد یہ ہوا ہے کہ تم کدھر سے پھرائے جارہے ہو یعنی کوئی دوسرا ہے جو تم کو اُلٹی پٹی پڑھا رہا ہے اور تم اس کے بہکائے میں آکر ایسی سیدھی سی عقل کی بات بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔ دوسری بات جو اس اندازِ بیان سے خود مترشح ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ تم کا خطاب پھرانے والوں سے نہیں بلکہ اُن لوگوں سے ہے جو اُن کے اثر میں آکر پھر رہے تھے۔ اس میں ایک لطیف مضمون ہے جو ذرا سے غور و فکر سے بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ پھرانے والے اسی معاشرے میں سب کے سامنے موجود تھے اور ہر طرف اپنا کام علانیہ کر رہے تھے۔ اس لیے ان کا نام لینے کی حاجت نہ تھی۔ اُن کو خطاب کرنا بھی بیکار تھا۔ کیونکہ وہ اپنی اغراض کے لیے لوگوں کو خدائے واحد کی بندگی سے پھیرنے اور دوسروں کی بندگی میں پھانسنے اور پھانسے رکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایسے لوگ ظاہر ہے کہ سمجھانے سے سمجھنے والے نہ تھے۔ کیونکہ نہ سمجھنے ہی سے ان کا مفاد وابستہ تھا، اور سمجھنے کے بعد بھی وہ اپنے مفاد کو قربان کرنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہو سکتے تھے۔ البتہ رحم کے قابل اُن عوام کی حالت تھی جو ان کے چکمے میں آرہے تھے۔ اُن کی کوئی غرض اس کاروبار سے وابستہ نہ تھی، اس لیے وہ سمجھانے سے سمجھ سکتے تھے۔ اور ذرا سی آنکھیں کھل جانے کے بعد وہ یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ جو لوگ انہیں خدا کے آستانے سے

اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے ۱۹ لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا ۲۰

ہٹا کر دوسرے آستانوں کا راستہ دکھلاتے ہیں وہ اپنے اس کاروبار کا فائدہ کیا اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گمراہ کرنے والے چند آدمیوں سے رُخ پھیر کر گمراہ ہونے والے عوام کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔

۱۹ یعنی تمہارے کفر سے اس کی خدائی میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں آسکتی۔ تم مانو گے تب بھی وہ خدا ہے۔ اور نہ مانو گے تب بھی وہ خدا ہے اور رہے گا۔ اس کی فرمانروائی اپنے زور پر چل رہی ہے تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یا عبادی لو ان اولکم و آخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی افجر قلب رجل منکم ما نقص من ملکی شیئاً۔ "اے میرے بندو۔ اگر تم سب کے سب اگلے اور پچھلے، انسان اور جنّ اپنے میں سے کسی فاجر سے فاجر شخص کے دل کی طرح ہو جاؤ تب بھی میری بادشاہی میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی" (مسلم)

۲۰ یعنی وہ اپنے کسی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ خود بندوں کے مفاد کی خاطر یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کفر کریں، کیونکہ کفر خود انہی کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چیز ہے اور رضا دوسری چیز۔ دنیا میں کوئی کام بھی اللہ کی مشیت کے خلاف نہیں ہو سکتا، مگر اس کی رضا کے خلاف بہت سے کام ہو سکتے ہیں اور رات دن ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً دنیا میں جبّاروں اور ظالموں کا حکمراں ہونا، چوروں اور ڈاکوؤں کا پایا جانا، قاتلوں اور زانیوں کا موجود ہونا اسی لیے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بنائے ہوئے نظامِ قدرت میں ان برائیوں کے ظہور اور ان اَشرار کے وجود کی گنجائش رکھی ہے۔ پھر ان کو بدی کے ارتکاب کے مواقع بھی وہی دیتا ہے اور اُسی طرح دیتا ہے جس طرح نیکوں کو نیکی کے مواقع دیتا ہے۔ اگر وہ سرے سے ان کی گنجائش ہی نہ رکھتا اور ان کو مواقع ہی نہ دیتا تو دنیا میں کبھی کوئی برائی ظاہر نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ بر بنائے مشیت ہے۔ لیکن مشیت کے تحت کسی فعل کا صدور یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ کی رضا بھی اس کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر اس بات کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص اگر حرام خوری ہی کے ذریعہ سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ

اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔[۲۱] کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔[۲۲] آخر کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔

انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے[۲۳] تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔[۲۴] پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اسی خدا کو بھول جاتا ہے جسے وہ

اسی ذریعہ سے اس کو رزق دے دیتا ہے۔ یہ ہے اس کی مشیت۔ مگر مشیت کے تحت چور یا ڈاکو یا رشوت خوار کو رزق دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چوری، ڈاکے اور رشوت کو اللہ پسند بھی کرتا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ یہاں فرما رہا ہے کہ تم کفر کرنا چاہو تو کرو، ہم تمہیں زبردستی اس سے روک کر مومن نہیں بنائیں گے۔ مگر ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ تم بندے ہو کر اپنے خالق و پروردگار سے کفر کرو، کیونکہ یہ تمہارے ہی لیے نقصان دہ ہے، ہماری خدائی کا اس سے کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

۲۱؎ کفر کے مقابلے میں یہاں ایمان کے بجائے شکر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ کفر درحقیقت احسان فراموشی و نمک حرامی ہے۔ اور ایمان فی الحقیقت شکر گزاری کا لازمی تقاضا ہے۔ جس شخص میں اللہ جل شانہٗ کے احسانات کا کچھ بھی احساس ہو وہ ایمان کے سوا کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے شکر اور ایمان ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ جہاں شکر ہو گا وہاں ایمان ضرور ہو گا۔ اور اس کے برعکس جہاں کفر ہو گا وہاں شکر کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ کفر کے ساتھ شکر کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

۲۲؎ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ کوئی شخص اگر دوسروں کو راضی رکھنے کے لیے، یا ان کی ناراضی سے بچنے کی خاطر کفر اختیار کرے گا تو وہ دوسرے لوگ اُس کے کفر کا وبال اپنے اوپر نہیں اٹھا لیں گے بلکہ اسے آپ ہی اپنا وبال بھگتنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا جس پر بھی کفر کا غلط اور ایمان کا صحیح ہونا واضح ہو جائے اس کو چاہیے کہ غلط رویہ چھوڑ کر صحیح رویہ اختیار کر لے اور اپنے خاندان یا برادری یا قوم کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق نہ بنائے۔

پہلے پکار رہا تھا[۲۵] اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتا ہے[۲۶] تاکہ اُس کی راہ سے گمراہ کرے[۲۷]۔ (اے نبی) اُس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اُٹھالے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔ (کیا اِس شخص کی روش بہتر ہے یا اُس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے اُمید لگاتا ہے؟ اِن سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟[۲۸] نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔ ع ۱ع

۲۳؎ انسان سے مراد وہ کافر انسان ہے جس نے ناشکری کی روش اختیار کر رکھی ہو۔

۲۴؎ یعنی اُس وقت اُسے وہ دوسرے معبود یاد نہیں آتے جنہیں وہ اپنے اچھے حال میں پکارا کرتا تھا، بلکہ ان سب سے مایوس ہو کر وہ صرف اللہ رب العالمین کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں دوسرے معبودوں کے بے اختیار ہونے کا احساس رکھتا ہے اور اس حقیقت کا شعور بھی اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں موجود ہے کہ اصل اختیارات کا مالک اللہ ہی ہے۔

۲۵؎ دوسرا مطلب اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس سے بچنے کے لیے وہ اپنے رب کو پکار رہا تھا۔

۲۶؎ یعنی پھر دوسروں کی بندگی کرنے لگتا ہے۔ انہی کی اطاعت کرتا ہے، انہی سے دعائیں مانگتا ہے، اور انہی کے آگے نذر و نیاز پیش کرنا شروع کر دیتا ہے۔

۲۷؎ یعنی خود گمراہ ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی یہ کہہ کہہ کر گمراہ کرتا ہے کہ جو آفت مجھ پر آئی تھی وہ فلاں حضرت یا فلاں بزرگ یا فلاں دیوی یا دیوتا کے صدقے میں ٹل گئی۔ اس سے دوسرے بہت سے لوگ بھی ان معبودانِ غیر اللہ کے معتقد بن جاتے ہیں اور ہر جاہل اپنے اسی طرح کے تجربات بیان کر کر کے عوام کی اس گمراہی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

۲۸؎ واضح رہے کہ یہاں مقابلہ دو قسم کے انسانوں کے درمیان کیا جا رہا ہے۔ ایک وہ جو کوئی سخت وقت آپڑنے پر تو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور عام حالات میں غیر اللہ کی بندگی کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اللہ کی اطاعت اور اس کی بندگی و پرستش کو اپنا مستقل طریقہ بنا لیا ہے اور راتوں کی تنہائی میں ان کا عبادت کرنا ان کے مخلص ہونے کی دلیل ہے۔ ان میں سے پہلے گروہ والوں کو اللہ تعالیٰ بے علم قرار

(اے نبی) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لاتے ہو، اپنے رب سے ڈرو[۲۹]۔ جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے[۳۰] اور خدا کی زمین وسیع ہے[۳۱]، صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا[۳۲]۔

دیتا ہے، خواہ انہوں نے بڑے بڑے کتب خانے ہی کیوں نہ چاٹ رکھے ہوں، اور دوسرے گروہ والوں کو وہ عالم قرار دیتا ہے۔ خواہ وہ بالکل ہی اَن پڑھ کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اصل چیز حقیقت کا علم اور اس کے مطابق عمل ہے۔ اور اسی پر انسان کی فلاح کا انحصار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دونوں آخر یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں یہ مل کر ایک طریقے پر چلیں، اور آخرت میں دونوں ایک ہی طرح کے انجام سے دوچار ہوں؟

۲۹؎ یعنی صرف مان کر نہ رہ جاؤ بلکہ اس کے ساتھ تقویٰ بھی اختیار کرو۔ جن چیزوں کا اللہ نے حکم دیا ہے اُن پر عمل کرو، جن سے روکا ہے ان سے بچو اور دنیا میں اللہ کے مواخذے سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔

۳۰؎ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی۔ ان کی دنیا بھی سدھر گی اور آخرت بھی۔

۳۱؎ یعنی اگر ایک شہر یا علاقہ یا ملک اللہ کی بندگی کرنے والوں کے لیے تنگ ہو گیا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ جہاں یہ مشکلات نہ ہوں۔

۳۲؎ یعنی اُن لوگوں کو جو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلنے میں ہر طرح کے مصائب و شدائد برداشت کریں مگر راہِ حق سے نہ ہٹیں۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دین و ایمان کی خاطر ہجرت کر کے جلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کریں، اور وہ بھی جو ظلم کی سرزمین میں جم کر ہر آفت کا سامنا کرتے چلے جائیں۔

حبش اور مسلمانوں کے تعلقات

عمر فاروق مودودی

(۳)

حروبِ صلیبیہ اور حبش جس زمانے میں حبشہ میں یہ انقلاب آیا، اس سے قبل دنیا ایک اور انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی۔ ہماری مراد صلیبی جنگوں سے ہے جن کا سلسلہ ۱۰۹۶ء سے لے کر ۱۲۹۱ء تک جاری رہا۔ صلیبی جنگوں میں اگرچہ مسیحی حبشہ نے کوئی حصہ نہیں لیا، تاہم وہ ان سے بالکل لاتعلق بھی نہیں رہا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مصر کے قبطی عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد نے السلطان الکامل ناصرالدین ایوبی کے خلاف شاہِ حبشہ لالیبلا سے پناہ طلب کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حبشہ کی مسیحی سلطنت بھی پوری طرح اس مذہبی تعصب سے سرشار تھی، جس نے تمام مغربی یورپ کو اپنے آپس کے اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خلاف صف آرا کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کی مسیحی دنیا میں یوحنا پادری کے زیر قیادت جس ایمپائر کے قیام کا خواب دیکھا جا رہا تھا۔ اس میں مملکتِ حبشہ بھی شامل تھی۔ اور سینٹ یونس کی خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے لشکرِ جرار سے مسیح کے تمام دشمنوں کو کچل ڈالے اور حبشیوں کے لیے بیت المقدس کی زیارت کا راستہ صاف کر ڈالے۔

جب صلیبی جنگوں کی آگ بجھ گئی تو یورپ کے مسیحی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ تو اس طرزِ فکر کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا جو صلیبی جنگوں کے آغاز کا سبب بنا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح صلیبی جنگوں کے ایک نئے سلسلے کی تمہید باندھی جائے۔ دوسرا گروہ دوبارہ جنگ کی آگ بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے خیال میں صلیبی عزائم کو بروئے کار لانے کے لیے قوت اور تشدد کا استعمال مناسب نہیں تھا۔ جہاں تک یورپ کا تعلق تھا، وہاں سیاسی اور مذہبی حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی

کہ محض مذہب کے نام پر اب وہاں کوئی تحریک کھڑی کرنی مشکل تھی۔ البتہ حبشہ میں ایسے اسباب پیدا ہو گئے جنہوں نے مذہبی تعصب کو دوگنا چوگنا کر دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تیرھویں صدی میں حبش تارکینِ وطن قبطی عیسائیوں کا ملجأ و ماوی بنا ہوا ہے اور نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ تمام مسیحی دنیا کو یہ باور کرا رہا ہے کہ وہ مسیحی ایمپائر کا مرکز اور تمام مسیحیوں کا مرجع ہے، جس کے فرمانروا یُوحنا کی قیادت میں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں حبشہ کے تخت پر جو بادشاہ بھی بیٹھتا ہے وہ اپنے لیے ایک مسیحی لقب اختیار کرتا ہے۔ مثلاً شاہ لالیبلا نے اپنے لیے جبر مسقل یعنی عبدالصیب کا لقب پسند کیا تھا۔ دوسرے چند بادشاہوں کے القاب یہ تھے، ناکوالآب یعنی آسمانی باپ کا شکر، نوای کرستوس یعنی مسیح کا ظرف یا آلہ کار، بئید مریم یعنی فدائے مریم، لبناد بخل یعنی مریم عذرا کا لوبان وغیرہ وغیرہ۔ یہی زمانہ ہے جب حبشہ کے لاٹ پادری کو جو مصری الاصل قبطی ہوتا تھا، ملک میں غیر معمولی اقتدار نصیب ہوا۔ شاہانِ حبش تمام مذہبی اور سیاسی امور میں لاٹ پادری پر انحصار کرنے لگے۔

گردوپیش کی مسلم ریاستوں سے حبش کی کشمکش ان حالات میں یکونو املاک اور اس کے جانشینوں کا مسلم دشمن ہونا محلِ تعجب نہ تھا۔ مزید برآں ملک کی عیسائی آبادی پہلے سے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عناد کے جذبات سے معمور تھی۔ اب ان کے دل جیتنے کے لیے ضروری تھا کہ نئے بادشاہ پرانے بادشاہوں سے بڑھ چڑھ کر مسلمانوں کے خلاف دشمنی کا مظاہرہ کریں۔ چنانچہ یکونو املاک نے تخت نشین ہوتے ہی قرب و جوار کی مسلمان ریاستوں[1] پر بھرپور حملہ کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس مہم میں اسے

[1] مشرقی افریقہ میں بحر ہند اور بحر احمر (خلیج عدن) کے ساحل پر بلاد سومال اور اریٹیریا واقع ہیں۔ بلاد سومال وہی علاقہ ہے جسے یورپ کی استعماری طاقتوں برطانیہ، فرانس اور اطالیہ نے برطانوی سومالی لینڈ، فرانسیسی سومالی لینڈ اور اطالوی سومالی لینڈ میں بانٹ لیا تھا۔ اس ملک کا کل رقبہ تین لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے جس میں سے ایک لاکھ مربع میل کا علاقہ اس وقت حبشہ کے قبضہ میں ہے۔ باقی علاقہ آزاد ہو چکا ہے اور سومالیہ کہلاتا ہے۔ بلاد سومال اور اریٹیریا میں عرب تارکینِ وطن کی آمد قدیم زمانہ سے جاری تھی۔ مختلف عوامل کے تحت عرب مہاجرین اپنے وطن چھوڑ کر اریٹیریا اور بلاد سومال میں جا کر آباد ہوتے رہے۔ یہ لوگ زیادہ تر تاجر، ماہی گیر اور ملاح تھے۔ اریٹیریا

بری طرح ناکامی ہوئی اور شدید جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا بلکہ اُلٹا انہوں نے جوابی حملہ کرکے حبشی شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ لیکن دوسری طرف مسلمان سلطنتوں کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ جب ایک دفعہ مصر کے مملوک سلطان الملک الظاہر بیبرس نے ایک سفارت شاہ حبشہ یکونو املاک کے پاس بھیجی تو شاہ حبشہ اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے سفارت کو فوراً ملاقات کا وقت نہ دے سکا۔ سفارت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱) کے مقابلے میں بلاد صومال میں عرب مہاجرین زیادہ تعداد میں آکر آباد ہوتے اور انہوں نے ساحلی علاقے میں اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں۔ ان ریاستوں میں زیلع اور مقدشو کی ریاستیں زیادہ مشہور ہیں۔

مقدشو کی ریاست دسویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔ تیرھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں ابوبکر بن فخرالدین نے یہاں دولتِ وراثیہ قائم کی۔ ابن بطوطہ نے ۱۳۳۱ء میں اس سلطنت کی سیاحت کی اور مختصر حالات لکھے۔ اس خاندان کے زیرِ سایہ مقدشو کی ریاست نے بڑا عروج حاصل کیا۔ ۱۴۹۹ء میں پرتگالیوں نے اس ریاست پر حملے کیے لیکن ناکام رہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں یہاں سلطان مظفر برسرِ اقتدار آیا۔ اس زمانہ میں صومالی قبائل نے اس ریاست پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیا جس نے اس ریاست کو بڑا ضعف پہنچایا۔ اٹھارویں صدی میں امام عمان سیف بن سلطان نے خاص شہر مقدشو پر حملہ کیا۔ اس کے بعد اس علاقے پر اطالویوں نے قبضہ کرلیا اور مقدشو کا شہر اطالوی سومالی لینڈ کا صدر مقام بن گیا۔

زیلع کی سلطنت کا پتہ تاریخ میں تیرھویں صدی عیسوی میں چلتا ہے۔ مقریزی کے قول کے مطابق حجاز کے قریش کی ایک جماعت نے اس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ دراصل یہ سلطنت سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں جب شاہ حبش یکونو املاک اور اس کے جانشینوں نے ان ریاستوں پر حملے کرنے شروع کیے تو انہوں نے شاہان حبش کے مقابلے کے لیے آپس میں اتحاد کرکے ایک وفاق بنا لیا اور زیلع اس کا صدر مقام قرار پایا۔ ان ساتوں ریاستوں کا یہ وفاق مسلمان مورخین میں اقلیم الطراز الاسلامی کے نام سے مشہور ہے۔ شروع شروع میں تو ان ریاستوں نے عزیمت سے کام لیا اور شاہانِ حبش کی چیرہ دستیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے لیکن جب ان میں پھوٹ پڑ گئی تو یہ وفاق ٹوٹ گیا اور یہ لوگ شاہانِ حبش کے باجگزار ہوگئے حتیٰ کہ ان ریاستوں کے سلاطین کا عزل و نصب بھی شاہانِ حبش کے اختیار میں آگیا۔ پھر جب ترکوں نے مصر فتح کرلیا تو خاص زیلع کا شہر یمن کے ترکی گورنر کے زیرِ انتظام آگیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں یہ سارا علاقہ برطانوی نوآبادی بن گیا۔

میں تاخیر ہونے پر الملک الظاہر بیبرس ناراض ہوگیا۔ اس کی اس ناراضگی کی اطلاع جب شاہ حبش کو پہنچی تو اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ بیبرس کو خط لکھا اور بڑی عاجزی کے ساتھ درگزر کی درخواست کی اور اس خط کو براہِ راست بیبرس کے پاس بھیجنے کے بجائے یمن کے گورنر کو واسطہ بنایا کہ وہ اس کا خط بیبرس کے پاس پہنچا دے۔ یہ ۱۲۷۳ء کا واقعہ ہے۔

چودھویں صدی عیسوی آتے آتے یہ صورتِ حال بڑی حد تک تبدیل ہوگئی۔ اب سلاطینِ مصر کے نام شاہانِ حبش کے خطوط کا لہجہ سخت ہوگیا اور وہ انہیں دھمکیاں تک دینے لگے۔ اسی زمانے میں حبشہ اور اس کے اردگرد کی مسلمان ریاستوں کے درمیان عداوت شدت پکڑ گئی۔ تاہم شاہانِ حبش کی چیرہ دستیوں نے مسلمان ریاستوں کے عوام کے جذباتِ غیرت کو بیدار کر دیا اور وہ علمِ جہاد لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مسلسل تین صدیوں تک خونیں جنگوں کا سلسلہ جاری رہا جس نے حبش کی دولتِ سلیمانیہ کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

پندرھویں صدی میں مملکتِ حبشہ کا ایک بہت بااثر رئیس اور فوجی سردار جس کا نام حرب جوش بتایا جاتا ہے مسلمان ہوگیا اور ایک عرب امیر سعد الدین کے پاس چلا گیا۔ حرب جوش کے اسلام نے مسلمانوں کو بڑی تقویت پہنچائی۔ مملکتِ حبشہ کے بہت سے اعیان و اکابر یا تو مسلمان ہوگئے یا انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ پھر حرب جوش نے سعد الدین کے بیٹے جمال الدین کے زمانے میں شاہانِ حبش کے صدر مقام اَمہرہ پر حملہ کیا۔ اس حملے میں اتنی کثرت سے قیدی ہاتھ لگے کہ ایک حبشی غلام کی قیمت ایک انگوٹھی رہ گئی۔ اس زمانے میں اہلِ امہرہ نے کثرت سے اسلام قبول کیا[1]۔

---

[1] جہاں تک حبشہ میں اشاعتِ اسلام کا تعلق ہے، یہ بات ثابت ہے کہ شاہانِ حبش کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسلام بتدریج حبشہ میں پھیلتا چلا گیا۔ چنانچہ ۱۲۷۳ء میں یکونو املاک شاہ حبش نے جو خط الملک الظاہر بیبرس کو بھیجا تھا اس میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کی فوج میں ایک لاکھ مسلمان سواروں کا رسالہ ہے۔

ترک اور حبش ۱۵۱۶ء میں سلطان ترکی سلیم اوّل نے مرج دابق کے معرکے میں مصر کے آخری مملوک سلطان قانصوہ الغوری کو شکست دی اور اپنے کمانڈر سنان پاشا کو عرب ممالک پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ سنان پاشا نے تمام عرب ممالک کو زیر کیا اور تمام شہروں میں ترک گورنر مقرر کر دیے۔ بحر احمر کی عربی بندرگاہیں بھی ترکوں کے تصرف میں آگئیں۔ دوسری جانب افریقی ساحل پر بھی ترکوں نے اپنا تسلط جما لیا۔ افریقی ساحل پر ترکوں کا یہ تسلط حبشہ اور عرب ریاستوں کے لیے بیک وقت تشویش کا باعث بن گیا۔ جہاں تک عرب ریاستوں کا تعلق تھا ان کا معاملہ تو نسبتاً آسان تھا۔ کیونکہ ترک ان کے دینی بھائی تھے۔ دوسری طرف خود ترک بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ افریقی عربوں کے ساتھ مفاہمت کرنے سے افریقہ میں ان کے لیے تجارت کی راہیں کھل جائیں گی۔ چنانچہ عرب ریاستوں نے تو فوراً ترکوں کی بالادستی قبول کر کے انہیں اپنا سرپرست بنا لیا۔ پھر اس کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ترکوں نے بحر احمر پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے کے لیے زیلع کے جزیرے پر قبضہ کر کے وہاں اپنا بحری بیڑا متعین کر دیا تھا۔ بہر حال عرب ریاستوں کو ترکوں کے سامنے نیازمندی ظاہر کرنے میں ہی عافیت نظر آئی۔ رہے اہلِ حبشہ تو ان کی مشکل دوہری تھی۔ ایک طرف وہ مسیحی تھے اور مسلمانوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اس لیے مفاہمت کے امکانات کم تھے۔ اور دوسری طرف وہ اپنے آپ کو فوجی طاقت میں ترکوں کا مدمقابل نہیں پاتے تھے کیونکہ حبشی فوجوں کے پاس ابھی تک تیر کمان اور نیزے تھے جبکہ ترک افواج جدید ترین اسلحہ اور جنگی وسائل سے لیس تھیں۔ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حبشہ کی ملکہ ایلینی نے جو قائم مقام بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کر رہی تھی شاہ پرتگال کو اپنی مدد کے لیے بلایا کیونکہ وہ بحر ہند میں پرتگالیوں کی فتوحات کا شہرہ سن چکی تھی۔

۱۵۲۵ء میں ملکہ ایلینی کا انتقال ہو گیا اور لبنا دنگل خود مختار حکمران ہو گیا۔ ادھر ترکوں نے پرتگال اور حبشہ کے اتحاد اور حبشہ میں پرتگال کے بڑھتے ہوئے اثرات کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ چنانچہ انہوں نے ریاست زیلع کے تخت پر احمد گرانی کو بٹھایا اور ترکی پاشا حاکم زبید کو اس کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ شریف مکہ نے بھی ایک امدادی فوج بھیج دی۔ غرض ان تیاریوں کے ساتھ احمد گرانی نے ۱۵۲۸ء میں حبشہ پر حملہ کر دیا

اور ایک ایک کر کے حبشہ کے مختلف شہر فتح کرتا رہا۔ جنگ کا یہ سلسلہ ۱۵۴۳ء تک جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں شاہ حبشہ مسلمانوں کے آگے آگے شہر بہ شہر بھاگتا رہا۔

حبشہ میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں اس حملے کے زبردست اور ہمہ گیر اثرات پڑے۔ احمد جرانی خود ایک پادری کا بیٹا تھا جو ترک وطن کر کے زیلع میں آباد ہو گیا تھا اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لیے جب اس نے حبشہ پر حملہ کیا تو حبشی زعماء کی ایک بڑی تعداد اپنے اتباع کے ساتھ اس سے آملی اور اسلام قبول کر لیا۔ ان نومسلم زعماء نے حبشی نوجوانوں کو داخل اسلام کرنے کے لیے اپنے ذاتی اثرات استعمال کیے اور ان کو اسلام کی طرف راغب کرنا چنداں مشکل بھی نہ تھا کیونکہ یہ لوگ مسیحی عقائد سے یکسر جاہل تھے۔ اس کے علاوہ اس حملے سے قبل جو مسلمان حبشہ میں آباد تھے انہوں نے احمد جرانی کے حملے کو غنیمت جانا اور اخلاص کے ساتھ تبلیغ میں لگ گئے۔ بہرحال ان کوششوں کے نتیجے میں صرف حبشی لشکر کے بیس ہزار سپاہی اپنے بال بچوں سمیت مسلمان ہو گئے۔

حبش میں مسلمانوں کی سیاسی پسپائی ۱۵۴۰ء میں لبنا دنجل مر گیا اور اس کا بیٹا جلاودیوس تخت پر بیٹھا۔ اس نے پرتگالیوں کی مدد سے اپنا چھنا ہوا ملک واپس لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۵۴۳ء میں ایک جنگ کے دوران احمد جرانی ایک پرتگالی سپاہی کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ احمد جرانی کے بعد اس کا ایک رشتہ دار امیر نورالدین اس کا جانشین ہوا اور اس نے ۱۵۵۹ء میں جلاودیوس کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ اس طرح ملک میں پیہم ایک کشمکش جاری رہی اور شاہان حبش یکے بعد دیگرے پرتگالیوں کی مدد سے اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینے کی کوشش کرتے رہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کو جو غلبہ و استیلاء حاصل ہو گیا تھا، آہستہ آہستہ وہ اس سے محروم ہوتے چلے گئے۔

حبش میں اشاعت اسلام سیاسی میدان میں مسلمانوں کی اس پسپائی کو عقیدہ و ایمان کے میدان میں اسلام کی پسپائی کے مترادف قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ اسلام قدیم زمانے سے آہستہ آہستہ ملک میں نفوذ کرتا جا رہا تھا۔ البتہ احمد جرانی کے حملے نے اس کی رفتار تیز کر دی تھی۔ ملک میں مسلمان تاجروں کی آمد و رفت مسلسل جاری تھی اور وہ حبشی عوام کو بکثرت داخل اسلام کرنے میں کامیاب

ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ عرب مبلغین تھے جو سینکڑوں کی تعداد میں وقتاً فوقتاً شمالی مشرقی افریقہ میں آتے رہتے تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی میں حضر موت سے چوالیس عرب مبلغین کی ایک جماعت افریقہ پہنچی اور بربرہ کی بندرگاہ پر اتر کر یہ لوگ اطراف و جوانب میں پھیل گئے۔ ان میں سے ایک صاحب جن کا نام شیخ ابراہیم ابوذر بامی تھا ۱۴۳۰ء کے قریب کے زمانے میں حبشہ کے شہر ہرر میں پہنچے اور دعوت و تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ ان کا مزار آج بھی اس شہر میں مرجعِ خلائق ہے۔

مبلغین اسلام کی یہ مساعی حبش کی عیسائی مملکت میں جس حد تک کامیاب رہی تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شاہ حبش فاسیلداس (۱۶۳۲ - ۱۶۶۷) کے عہد میں ملک کے عیسائی عناصر کی جانب سے بادشاہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اسلام کی تعلیم کے لیے یمن سے معلمین بلوائے ہیں۔ قبولِ اسلام کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ حقیقت ہے کہ شاہ فاسیلداس نے ۱۶۴۲ء میں امام یمن المؤید باللہ کو خط لکھا کہ وہ اسلام کی دعوت کے لیے ایک مشن بھیجے۔ لیکن امام یمن نے کسی کو نہ بھیجا۔ پانچ سال کے بعد اس نے پھر ایک خط لکھ کر مشن بھیجنے کی درخواست کی۔ چنانچہ امام یمن نے ایک تبلیغی وفد بھیج دیا جو کچھ عرصہ وہاں رہ کر واپس آ گیا۔

مسلمان باشندوں کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کا آغاز

حبشہ میں اسلام کی روزافزوں اشاعت سے آخر کار مسیحی عناصر خطرہ محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ شاہ حبشہ یوحنس الاول (۱۶۶۷-۱۶۸۲ء) نے اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال ایک مجلس منعقد کی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ عیسائیوں کے قریب نہ رہیں بلکہ ان سے دور جا کر آباد ہوں۔ پھر ۱۶۷۸ء میں اس حکم کی تجدید کی گئی۔

اب تک حبش کی مسیحی سلطنت نے صرف ان مسلمانوں کے خلاف معاندانہ کارروائیاں کی تھیں جو حدودِ حبشہ سے باہر آباد تھے اور جن کو وہ اپنی [illegible] دیتے تھے۔ لیکن اندرونِ ملک میں رہنے والے مسلمانوں سے کبھی کسی نے تعرض نہیں کیا تھا۔ یوحنس الاول پہلا بادشاہ ہے جس نے مسلمانانِ حبش کو معاندانہ کارروائیوں کا ہدف بنایا۔ اور پھر دوسرے بادشاہوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ملک کی مسلمان آبادی کے خلاف شاہانِ حبش کو جس چیز نے سب سے زیادہ بھڑکایا وہ یہ تھی کہ بعض حبشی زعماء باوجود عیسائی ہونے کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشن مثال راس علی کی تھی جو بیجا مدر کا حاکم اور بادشاہ کا نائب تھا۔ "تھیوڈر شاہ حبشہ (۱۸۵۵ء-۱۸۶۸ء) سے پہلے دو ڈھائی سال ملک میں عملاً راس علی ہی کا راج تھا۔ وہ اگرچہ خود عیسائی تھا، تاہم مسلمانوں کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی رکھتا تھا۔ حکومت کے مناصب پر اس نے کثرت سے مسلمانوں کو مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں سلطنتِ حبشہ کے وسطی علاقوں کی نصف کے قریب آبادی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھی۔ ان سب امور کا ردِ عمل اس شدید ظلم و ستم کی صورت میں ظاہر ہوا جو شاہ تھیوڈر نے مسلمانوں پر ڈھایا

مسلمان رعایا کے خلاف شاہانِ حبش کے غیظ و غضب کو برانگیختہ کرنے میں دوسرا جو عامل کار فرما ہوا وہ مصر اور حبشہ کے باہمی جھگڑے تھے۔ یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مصر اور حبشہ کے تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے تھے تاہم اس سے پہلے کبھی جنگ و جدل کی نوبت بھی نہیں آئی تھی جس کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ مصر میں یکے بعد دیگرے جو خاندان برسرِ اقتدار آتے رہے وہ اس قدر طاقتور تھے کہ شاہانِ حبش ان سے زور آزمائی کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ حبشہ کا لاٹ پادری مذہبی روایت کے طور پر اسکندریہ سے آیا کرتا تھا۔ اس لیے حبشہ کو طوعاً کرہاً مختلف ادوار میں مصری حکومتوں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے پڑتے تھے لیکن چونکہ دل میں تلخی موجود رہتی تھی اس لیے جونہی کوئی کمزور حکمران مصر میں آتا تھا یا مصر کے سیاسی حالات دگرگوں ہوتے تھے تو فوراً ہی حبشی حکومت کا رویہ سخت ہو جاتا تھا۔

سنہ ۱۸۶۵ء میں جب ترکوں نے اریٹیریا کی بندرگاہ مصوع خالی کر دی اور مصریوں نے ان کی جگہ لے لی تو مصر اور حبشہ کے تعلقات نے ایک نئی کروٹ لی۔ مصوع میں پاؤں جمانے کے بعد مصری شمالی، جنوبی اور مغربی حبشہ کی طرف بڑھے اور مختلف مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد خدیو مصر اسمٰعیل پاشا نے حبشہ پر حملہ کرنے کے لیے مصوع کے راستے ایک فوج بھیجی۔ ۱۷ نومبر ۱۸۷۵ء کو یوحنس رابع

شاہِ حبش نے بلا جدی کے معرکے میں اس فوج کو شکست دے دی۔ چند ماہ بعد خدیو مصر اسمٰعیل نے اپنے بیٹے حسن پاشا کی قیادت میں ایک اور مہم بھیجی مگر اسے بھی ۷ مارچ ۱۸۷۶ء کو معرکہ جورا میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اسلام اپنے خلافِ قانون مذہب اگرچہ مصر نے یہ حملے کسی مذہبی تعصب کی بنا پر نہیں کیے تھے لیکن شاہ حبش یوحنس رابع نے ان حملوں کو مذہبی رنگ دیا اور انہیں آڑ بنا کر ۱۸۷۸ء میں حبشی کلیسا کے ارکان کی ایک مجلس بلائی۔ اس مجلس میں امورِ مذہبی کے لیے ایک قانون کا اعلان کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ تمام ملک میں ایک ہی مذہب ہونا چاہیے۔ چنانچہ تمام عیسائی فرقوں نے سوائے یعقوبیوں اور ان عیسائیوں کے جو قدیم زمانے سے حبشی کلیسہ کے پیرو کار تھے دو سال کی مہلت مقرر کی کہ اس کے بعد وہ سب ایک قومی کلیسا کے مذہب پر متفق ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کے لیے تین سال اور بت پرستوں کے لیے پانچ سال کی مدت مقرر کر دی گئی کہ اس عرصے میں وہ اپنے مذہب سے دست بردار ہو کر قومی کلیسا کو تسلیم کر لیں۔

اقتصادی دباؤ اس قانون کے نفاذ کے چند روز بعد شاہ یوحنس نے ایک آرڈی ننس کا اعلان کیا جس کی رُو سے تمام مسلمان سرکاری ملازمین کو نوٹس دیا گیا کہ اگر تین ماہ کے اندر انہوں نے بپتسمہ قبول نہ کیا تو انہیں ان کے مناصب سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس آرڈی ننس کے نفاذ کے بعد جو سرکاری ملازمین جبری بپتسمہ لینے پر آمادہ ہو بھی گئے ان کی حالت یہ تھی کہ کلیسا میں بپتسمہ دیئے جانے کے بعد فوراً ہی یہ لوگ مسجد کی جانب لپکتے تھے اور علماء کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تاکہ بپتسمہ کے اثرات کی تلافی ہو سکے۔ مزید برآں اس آرڈی ننس میں صرف مردوں کا ذکر کیا گیا تھا، اس لیے عورتیں اس جبری بپتسمہ سے محفوظ رہیں اور یہ چیز اسلام کی حفاظت کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن گئی بلکہ اس نے آرڈی ننس کی ساری غرض و غایت ہی کو ختم کر کے رکھ دیا۔

جبری بپتسمہ کی مہم اقتصادی دباؤ کے ذریعے عیسائیت کے فروغ اور اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کے نتائج جب خاطر خواہ نہ نکلے تو شاہ یوحنس نے ۱۸۸۰ء میں جبری بپتسمہ دینے کی ایک مہم

مہم چلائی جس کے دوران پچاس ہزار حبشی مسلمانوں کو بپتسمہ لینے پر مجبور کیا گیا۔ اسی طرح ایک بت پرست قبیلے کے بیس ۲۰ ہزار افراد اور دوسرے قبیلے کے پانچ لاکھ افراد کو عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جو مسلمان کسی طرح عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے انہیں مار کھدیڑ کر ان کے علاقوں سے نکال دیا گیا اور وجوہ معاش سے محروم کر دیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں سیرای اور حماسین کے مسلمانوں نے بصد مشکل اس شرط پر اپنے علاقوں میں رہنے کی اجازت حاصل کی کہ وہ عیسائیوں کی آبادیوں سے دور اپنی بستیاں بسائیں گے۔

مہدی سوڈانی کی تحریک اور حبش | ایک طرف حبشہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے یہ پہاڑ ٹوٹ رہے تھے جس کے نتیجے میں سینکڑوں کی تعداد میں حبشی مسلمان ہجرت کر کے سوڈان پہنچ رہے تھے اور دوسری طرف سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریک تیزی کے ساتھ کامیابی کی منازل طے کرتی جا رہی تھی۔ مہدی سوڈانی نے ۱۸۸۱ء سے لے کر ۱۸۸۵ء تک یکے بعد دیگرے کردفان، دارفور، بحر الغزال، سنار اور خرطوم پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ حبشہ میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ مہدی سوڈانی وہی مہدیٔ منتظر ہے جو لوگوں کو کفر اور ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے آیا ہے! اس خیال کا پھیلنا تھا کہ بے شمار حبشی مسلمان ہجرت کر کے مہدی سوڈانی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ان مہاجرین میں ایک شخص محمد جبریل بھی تھا جس کا شمار حبشہ کے زعماء میں ہوتا تھا۔ چنانچہ مہدی نے حبشی عیسائیوں میں، سلام کی تبلیغ اور مسلمانوں میں مہدویت کے پرچار کے لیے محمد جبریل کو حبشہ بھیجا۔

حبشہ میں اس تحریک نے جلد ہی کامیابی حاصل کر لی۔ شاہ یوحنس کی سگی بہن نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان رئیس سے شادی کر لی۔ حبشی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اس تحریک میں شامل ہو گئی اور شمالی انقلابات میں عرادیب کے مقام پر انہوں نے ایک قلعہ تعمیر کر کے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ اس اثناء (۱۸۸۵ء) میں مہدی کا انتقال ہو گیا اور تعایشی اس کا خلیفہ ہوا۔ تعایشی نے حبشی مہدویوں پر محمد فقرا کو امیر مقرر کر کے اسے حبشہ کے اطراف پر حملہ کرنے

کا حکم دیا۔

القلابات کا علاقہ مہدوی تحریک کا بہت بڑا مرکز بن چکا تھا جس میں اس تحریک کے حامی مسلمان حبشیوں کی ایک کثیر تعداد آباد تھی۔ شاہ حبشہ کے لیے یہ ایک ایسا خطرہ تھا جس کو وہ کسی قیمت پر بھی نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ ایک طرف اس نے محمد نقرا کے حملوں کی روک تھام کے لیے سرحدی ملیشیا کا بندوبست کیا اور دوسری طرف خود القلابات پر حملہ کرنے کے لیے پے درپے فوجیں بھیجنی شروع کیں۔

اس طرح مہدویوں اور سلطنتِ حبشہ کے درمیان ایک مسلسل کشاکش شروع ہو گئی۔ کبھی حبشی فوجیں القلابات پر حملہ کرتیں اور مہدویوں کو نکال باہر کرتیں اور کبھی مہدوی آگے بڑھتے اور حبشی فوجوں کو شکستیں دیتے ہوئے نہ صرف القلابات خالی کرا لیتے بلکہ خود حبشی سرحدوں کے اندر گھس کر حبشی شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالتے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا تا آں کہ ۱۸۸۹ء میں ایک زبردست معرکے کے بعد یوحنس شاہ حبشہ قتل کر دیا گیا اور اس کا سر تعایشی کے پاس ام درمان[۱] بھیج دیا گیا۔ یوحنس کے قتل ہو جانے کے بعد مینلک دوم حبشہ کے تخت پر بیٹھا۔

حبش ایک نئے دور میں یہاں سے حبشہ ایک نئے دور میں داخل ہوتا ہے۔ کیونکہ پورا براعظم افریقہ اب یورپ کی استعماری طاقتوں کے نوآبادیاتی نظام کی تجربہ گاہ بن چکا تھا۔ جس یورپین ملک نے سب سے پہلے افریقی براعظم میں دلچسپی لی وہ پرتگال تھا۔ پرنس ہنری جو شاہ جان اول کا بیٹا تھا اپنے دل میں پرتگال کے لیے افریقہ کے نامعلوم حصوں کو حاصل کرنے کا بے پناہ جذبہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی تحریک اور ہدایت پر افریقی براعظم کی دریافت کے لیے

---

[۱] ام درمان سوڈان میں جنوبی دریائے نیل کے مغربی کنارے پر اس جگہ واقع ہے جہاں نیل ازرق اور نیل ابیض آپس میں ملتے ہیں۔ ام درمان اور سوڈان کے دارالسلطنت خرطوم کے درمیان ایک پل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر مہدی سوڈانی کا وطن اور اس کی تحریک کا مرکز تھا۔

پے در پے کئی بحری مہمیں بھیجی گئیں جن کے نتیجے میں سنہ ۱۵۰۶ء تک گنی کا تمام ساحلی علاقہ پرتگال کے زیر اثر آگیا۔ اگرچہ پرتگالی سیاح کانگو تک پہنچ چکے تھے لیکن پرتگال نے اپنی سرگرمیاں گنی تک محدود رکھیں اور ساحل کے ساتھ ساتھ تجارتی کوٹھیاں اور جنگی قلعے تعمیر کرکے بڑے پیمانے پر سونے، ہاتھی دانت، صندل اور غلاموں کی تجارت شروع کردی۔ سونے ہاتھی دانت اور غلاموں کی کشش سنہ ۱۵۶۲ء میں انگریز جہازرانوں کو بھی افریقہ کھینچ لائی اور ان کے پیچھے پیچھے ہسپانوی، ڈچ، فرانسیسی، ڈینش اور اطالوی بھی پہنچ گئے۔ سترھویں صدی میں افریقہ کے ساحلی علاقے پر پرتگال کی برتری ہالینڈ کے پاس چلی گئی اور اٹھارویں صدی میں انگلینڈ اور فرانس کی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ افریقی براعظم کی نوآبادیوں پر ان دونوں ملکوں کو پوری بالادستی حاصل ہوگئی۔ انیسویں صدی میں اس براعظم میں یورپین ممالک کی مسابقت و منافست اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

<u>سیاہ اور سفید استعمار کا گٹھ جوڑ</u>: یہ وہ وقت ہے جب حبشہ کے تخت پر مینلک دوم متمکن ہے۔ اور افریقہ کے اسٹیج پر جو ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا، اس میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ شمالی افریقہ میں اس وقت سب سے زیادہ مضبوط ملک حبشہ ہی تھا۔ اگرچہ اس کے ایک طرف سوڈان اور دوسری طرف بلاد سومال کے مسلم علاقے موجود تھے جنہیں ترکی کی سرپرستی حاصل تھی۔ لیکن یہ مرد بیمار اب خود اپنے وجود کی خیر منا رہا تھا۔ اس لیے افریقہ کے اس حصے میں یورپ کی مسیحی استعماری طاقتوں نے مسیحی حبشہ کو ہی درخور اعتنا سمجھا۔ چنانچہ ۲۶ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو اٹلی اور حبشہ کے درمیان ایک معاہدۂ امن ہوا جس میں حبشہ کی خودمختار حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس کے بعد ہی رُوس کے تین مشن، فرانس کے دو مشن اور برطانیہ کا ایک مشن حبشہ پہنچا۔ یہ سب مشن حبشہ کے ساتھ اپنے اپنے مفادات کے لیے گفت و شنید کرتے رہے۔ آخرکار ۱۵ مئی ۱۸۹۷ء کو برطانیہ اور حبشہ کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہوگیا۔ سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۴ء کے درمیان حبشہ نے برطانیہ کو سومالی لینڈ میں "دیوانے ملا[1]" کو کچلنے کے لیے فوجی مدد دی اور چار مشترکہ مہمیں بھیجی گئیں۔

---

[1] بلادِ سومال میں یورپ کے استعماری عزائم کو ناکام بنانے اور اپنے ملک کی آزادی کی حفاظت ؎

۱۵ مئی ۱۹۰۲ء کو حبشہ اور برطانیہ کے درمیان سوڈان (جو برطانیہ کا غلام بن چکا تھا) اور حبشہ کی سرحد کے تعین کے لیے ایک اور معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے میں مینلک شاہِ حبشہ نے نیل کی آب پاشی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ ۱۹۰۱ء میں حبشہ اور برطانیہ کی ایک مشترکہ مہم اس غرض کے لیے بھیجی گئی کہ وہ ایک طرف حبشہ اور دوسری طرف برطانوی مشرقی افریقہ اور یوگنڈا کی سرحدیں تجویز کرے اور ان کا سروے کرے۔ اس کمیشن کی رپورٹ پر ۱۹۰۸ء میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں سرحدوں کی تعیین کی گئی تھی۔ اس اثنا میں حبشہ پر یورپین اثرات برابر بڑھتے رہے اور یورپ کے بیشتر ممالک نے اپنے مستقل سفارتی نمائندے مینلک کے دارالسلطنت میں بھیج دیئے۔

حبشی امپیریلزم ایک طرف مینلک نے یورپ کی استعماری طاقتوں سے یوں گٹھ جوڑ کیا اور دوسری طرف اس نے اپنے چھوٹے سے ملک کو "ایمپائر" بنانے کے لیے اردگرد کی مسلمان ریاستوں

۴۔ کرنے کے لیے قبیلہ ہبر سلیمان کا ایک شخص محمد بن عبداللہ کھڑا ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے مہدی سوڈانی کی طرز پر ایک تحریک منظم کر لی۔ ۱۸۹۹ء میں اس نے برطانوی سومالی لینڈ پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ محمد بن عبداللہ کی اس تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لیے بیک وقت برطانیہ، اٹلی اور حبشہ میدان میں آگئے اور برطانوی ایئر فورس نے اس کی کمین گاہوں پر شدید بمباری کی۔ لیکن یہ مردِ حق برابر ڈٹا رہا اور اپنی گوریلا جنگ کے ذریعے استعماری طاقتوں کو مسلسل شدید جانی و مالی نقصان پہنچاتا رہا۔ نومبر ۱۹۱۴ء سے لے کر فروری ۱۹۱۵ء تک برطانوی سامراج نے اس کے بے شمار ساتھیوں کو جو درویش کہلاتے تھے پھانسیوں پر لٹکا دیا۔ ان تمام کوششوں کے باوجود محمد بن عبداللہ ۱۹۲۰ء تک سرگرم عمل رہا اور اس نے برطانوی مقبوضہ علاقے کے ایک بڑے حصے کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ آخرکار ۱۹۲۱ء میں اس کے انتقال کے ساتھ یہ تحریک ختم ہو گئی۔ برطانوی ڈپلومیسی نے اس محبِ وطن بطلِ حریت کو "دیوانے ملا" کا خطاب دے رکھا تھا۔

۵۔ ایتھیوپین شاہ مینلک دوم کو THE FOUNDER OF THE ETHIO-PIAN EMPIRE. کے نام سے یاد کرتے ہیں

کو یکے بعد دیگرے ہڑپ کرنا شروع کردیا اور بلاشبہ یہ استعماری طاقتیں جو خود بڑے بڑے مسلمان ملکوں کی آزادی پر مختلف حیلوں بہانوں سے ڈاکے ڈال رہی تھیں، چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کی آزادی چھیننے میں حبشہ کی پوری طرح ممد و معاون تھیں۔

مینلک نے جن مسلمان ریاستوں پر حملے کرکے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کیا ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں۔ ہرار۔ اوسا۔ والو۔ جما۔ اردسی اور اوگیڈن۔ یہ ریاستیں موجودہ ایتھیوپین ایمپائر کے کل رقبے کا تین چوتھائی ہیں۔ اگرچہ ان ریاستوں نے اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے پوری جدوجہد کی لیکن ان کے تیر تلوار مینلک کے جدید ترین آتشیں اسلحہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ مزید برآں ان ریاستوں کے اردگرد کے مسلم علاقے مصر، سوڈان، اریٹیریا اور بلاد سومال پہلے ہی اپنی آزادی کھو چکے تھے۔ بہرحال یہ مسلمان ریاستیں حبشی سامراج کے سامنے سرنگوں ہوگئیں اور سامراج نے ان میں لوٹ مار کے وہی مظاہرے کیے جو اس کی سرشت میں داخل ہیں۔ ناروے کا ایک معاصر مصنف جان بکالزر اپنی کتاب "جلتے ہوتے چہروں کی سرزمین" میں ان حملوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے :

"ایک ٹڈی دل کی طرح وہ اور اس کی فوج ملک بھر میں جدھر سے گزری سب کچھ چٹ کر گئی۔ فوجیوں نے اپنے ساتھ اپنی عورتوں کو بھی لے لیا اور فوج کا عقب انہیں عورتوں پر مشتمل تھا۔ یہ عورتیں محکمہ رسد میں شامل تھیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ گھروں سے اندوختہ لے کر چلے تھے مگر وہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے لوٹ مار شروع کردی۔ ویسے بھی مینلک اپنی فوج کو کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں دیتا تھا۔ جو کچھ وہ لوٹ مار کے ذریعہ حاصل کریں وہی ان کی تنخواہ تھی۔ جنگ کے دوران فوج کا عقب کچھ نہیں ہوتا تھا کیونکہ بہترین مال غنیمت اسی کے حصے میں آتا تھا جو سب سے آگے ہوتا تھا۔"

اس طرح موجودہ ایتھیوپین ایمپائر وجود میں آئی۔ مسلح فوجی دستوں نے تمام مفتوحہ علاقے میں

لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ زمینوں پر قبضہ کر لیا اور مالکوں کو غلام بنا لیا۔ مینلک نے اپنے نئے مفتوحہ علاقے کے لیے جو پالیسی وضع کی اس کا کچھ اندازہ ارنسٹ ڈبلیو لوتھر کی کتاب "آج کا ایتھیوپیا" کے اس اقتباس سے ہوسکتا ہے۔

"پچھلی صدی کے اختتام پر شاہ مینلک دوم نے اپنی وسیع مہموں کے دوران بڑے بڑے رقبوں پر قبضہ کر لیا۔ ان میں سے بیشتر رقبوں کو تو اس نے اپنی ذاتی جاگیر میں داخل کر لیا اور باقیماندہ رقبوں میں سے کچھ اپنے دوست احباب کو دے دیئے اور کچھ وفادار فوجی افسروں کو۔ بچی کھچی زمین مفتوحین کے پاس رہنے دی گئی۔"

یہ کارروائیاں تو وہ تھیں جو ہوس ملک گیری کے تحت کی گئیں۔ مذہبی تعصب کی تسکین کی خاطر مفتوحہ مسلمان ریاستوں میں تمام اسلامی مدارس یک قلم بند کر دیئے گئے۔ ان کے اوقاف اور عطیات سب ضبط کر لیے گئے اور علماء اور شیوخ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ تعلیم و تبلیغ کا کام چھوڑ دیں۔ جو باز نہ آئے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

۱۹۰۶ء کے سہ جماعتی معاہدے کے تحت مینلک نے انگلینڈ، فرانس اور اٹلی کو مفتوحہ مسلم علاقے میں خاص مراعات دیں۔ فرانس کو حبشہ کے دارالسلطنت ادیس ابابا سے فرانسیسی سومالی لینڈ کے صدر مقام جبوتی تک ریلوے لائن ڈالنے کی اجازت دی۔ فرانس نے اس ریلوے لائن کی تعمیر میں بیس سال تک مقامی مسلمان باشندوں سے جبری بیگار لی۔ اٹلی کو اپنی دو نوآبادیوں اریٹریا اور اطالوی سومالی لینڈ کو ملانے کے لیے درمیانی مسلم علاقے میں جو حبشہ کے قبضے میں ہے ایک پٹی دی گئی۔

(باقی)

روداد جماعتِ اسلامی پاکستان

از یکم دسمبر ۵۵ء تا ۳۰ر ۶۳ء

[جماعت اسلامی کی یہ روداد دراصل جماعت کے کُل پاکستان اجتماع منعقدہ لاہور میں ۲۵ر اکتوبر کو پیش کی جانی تھی لیکن لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت نہ ملنے۔ اور پھر غنڈوں کے حملے کی وجہ سے جو حالات پیدا ہوئے ان کی وجہ سے اس کو اجلاسِ عام میں نہ پیش کیا جا سکا۔ اب اسے یہاں درج کیا جا رہا ہے تاکہ پچھلے آٹھ سال کی روداد جماعت لوگوں کے علم میں آ سکے]

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آٹھ سال کے شدید دورِ آزمائش کے بعد اس نے پھر ہمیں اس اجتماعِ عام میں جمع ہونے کا موقع مرحمت فرمایا ہے تاکہ تین چار دن مسلسل ایک ساتھ رہ کر ہم ایک دوسرے سے واقف اور قریب تر ہوں، ہم میں باہم یگانگت و ہم آہنگی اور یکسانی پیدا ہو۔ ہم آپس میں غور و بحث اور مشوروں سے اللہ کے دین کی سربلندی اور اپنے ملک میں اسے جاری و ساری کرنے کی سبیلیں سوچیں۔ جن لوگوں کو ہم نے اپنے اصحابِ امر مقرر کیا ہے ان کو قریب سے دیکھیں ان سے حتی الامکان شخصاً واقف اور مربوط ہوں۔ ان کے کام کا بلاواسطہ مشاہدہ ہی نہیں آزادانہ محاسبہ بھی کریں اور یہ اصحابِ امر بھی پورے ملک میں پھیلے ہوئے ساتھیوں کی قوتوں، قابلیتوں، صلاحیتوں اور سیرت و کردار سے براہِ راست واقف ہو سکیں۔ پھر سب مل کر آئندہ کے لیے ایک پروگرام بنائیں اور ہر شخص واپس پہنچ کر پوری یکسوئی اور تندہی کے ساتھ اپنی جگہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں لگ جائے۔

جماعتِ اسلامی پاکستان کے کُل پاکستان اجتماعات اس سے پہلے صرف تین مرتبہ ہوئے ہیں۔ پہلا اجتماع عام اسی شہر لاہور میں دہلی دروازے کے باہر مئی ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا۔ دوسرا اجتماع کراچی میں ۱۰ تا ۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء، اور تیسرا بھی کراچی ہی میں ۲۱ تا ۲۴ نومبر ۱۹۵۵ء منعقد ہوا۔ اگرچہ فروری ۱۷ تا ۲۱ ۱۹۵۷ء میں بھی ایک اجتماع ماچھی گوٹھ تحصیل صادق آباد ضلع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا تھا جس میں جماعت کے بارہ سو چھپن ارکان میں سے نو سو انچاس شریک ہوئے تھے، مگر وہ صرف جماعت کے تنظیمی و دستوری مسائل اور پالیسی اور پروگرام کے فیصلہ کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ اس لیے اس میں صرف ارکان کو دعوت دی گئی تھی، متفقین اور عام سامعین کو اس میں نہیں بلایا گیا تھا۔ اُس اجتماع میں جماعت کا نصب العین، طریق کار اور آئندہ کا لائحہ عمل جس شکل میں طے ہوئے تھے وہ "تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان کا موجودہ دستور بھی ارکان جماعت کے اُسی اجتماع عام کی ہدایات اور قراردادوں کے مطابق مرتب کردہ ہے۔

۱۹۵۵ء کے بعد سے جماعت کی عددی قوت میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اُس وقت کیمپ میں مقیم حضرات کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب تھی، اور اب ہمارے کیمپ میں مقیم مہمانوں کی تعداد سات ہزار سے زائد ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کا موجودہ نظام

جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی نظام امیرِ جماعت: ــــــــــــــــ مرکزی مجلسِ شوریٰ، مجلس عاملہ، قیمّ جماعت اور دسیوں مرکزی شعبوں پر مشتمل ہے۔ امیرِ جماعت کا انتخاب ہر پانچ سال کے بعد تمام ارکانِ جماعت کے بلا واسطہ ووٹوں سے ہوتا ہے۔ جماعت کے نظام اور تمام معاملات میں امیرِ جماعت کی مدد اور مشورے کے لیے مرکزی مجلسِ شوریٰ موجود ہے جو ارکانِ جماعت کے بلا واسطہ منتخب کردہ پچاس ارکان پر مشتمل ہے۔ مجلسِ شوریٰ

کا انتخاب ہر تین سال کے بعد ہوتا ہے۔ جماعت کی پالیسی اور پروگرام کی تشکیل، جماعت کے دستور کی تعبیر اور ترمیم، جماعت کا مرکزی بجٹ پاس کرنا، جماعت کے نصب العین کے حصول کے لیے ضروری اقدامات کا فیصلہ کرنا، امیر جماعت اور اس کے ماتحت مرکزی شعبوں کے کاموں کا محاسبہ اور ان پر بحث و تنقید، سب مجلس شوریٰ کے اختیارات اور فرائض میں شامل ہیں۔ مرکزی مجلس شوریٰ دو تہائی ووٹوں کی اکثریت سے امیر جماعت کو معزول کر سکتی ہے۔

امیر جماعت مجلس شوریٰ کے منتخب ارکان میں سے بارہ ارکان پر مشتمل مجلس عاملہ مقرر کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور جب مجلس شوریٰ کا اجلاس نہ ہو رہا ہو یا اس کا اجلاس بلانا مشکل ہو تو مجلس عاملہ مجلس شوریٰ کے جملہ اختیارات (باستثناء ترمیم دستور و عزلِ امیر) استعمال کر سکتی ہے لیکن مجلس شوریٰ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مجلس عاملہ کے کسی فیصلے کی توثیق کرے یا اسے جزوی یا کلی طور پر منسوخ کر دے۔

قیمِ جماعت کی حیثیت جماعت کے سیکرٹری جنرل کی ہے۔ اسے امیرِ جماعت مجلس شوریٰ کے مشورے سے مقرر کرتا ہے۔ وہ امیرِ جماعت کا مددگار، اس کا نمائندہ اور اس کے سامنے جوابدہ ہے۔

مرکزی شعبے

اس وقت جماعت اسلامی پاکستان میں حسبِ ذیل چھ شعبے کام کر رہے ہیں:

شعبۂ تنظیم جماعت، شعبۂ مالیات، شعبۂ نشر و اشاعت، شعبۂ پارلیمانی امور، شعبۂ دار العروبۃ شعبۂ استفسارات (رسائل و مسائل)

ان کے علاوہ شعبۂ انتخابات کے قیام کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور وہ بھی انشاء اللہ عنقریب قائم کر دیا جائے گا۔

ماتحت نظام

جماعت کے اس مرکزی نظام کے تحت پورے ملک کو سترہ حلقوں (ڈویژنوں) میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مشرقی پاکستان جماعت کے چار تنظیمی حلقوں پر مشتمل ہے اور اسے صوبہ مشرقی پاکستان کی امارت کے ماتحت کر دیا گیا ہے جس کا مرکز ڈھاکہ میں ہے۔ مغربی پاکستان نیز تنظیمی حلقوں میں تقسیم ہے۔ ہر حلقہ میں منتخب امراء، ان کی مجالس شوریٰ اور چند ایک کے سوا قیم حلقہ بھی موجود ہیں۔ امرائے حلقہ اور ان کی مجالس شوریٰ بھی ان حلقوں کے ارکان سے براہِ راست منتخب ہوتے ہیں۔ یہی نظام تقریباً ہر ضلع میں موجود ہے۔

ضلعی نظام کے ماتحت مقامی جماعتیں اور حلقہ ہائے متفقین کام کرتے ہیں۔ اور بڑے شہروں کی مقامی جماعتوں کا نظام بھی امیر، مجلس شوریٰ اور قیم جماعت، پر مشتمل ہے۔ تمام مقامی امرائے جماعت اور مقامی مجالس شوریٰ کے ارکان کو بھی اس مقام کے ارکان بلاواسطہ انتخاب کے ذریعے منتخب کرتے ہیں۔

حلقوں کی مجالس شوریٰ کا انتخاب ہر دو سال کے بعد اور ضلعوں میں جماعت کی مجالس شوریٰ کے انتخابات ہر سال از سر نو کرائے جاتے ہیں۔

حلقۂ خواتین جماعت اسلامی پاکستان

جماعت اسلامی پاکستان کی ارکان اور متفق خواتین کا نظام مردوں سے بالکل الگ قائم ہے۔ ان کی اپنی مجلس شوریٰ اور قیمہ حلقۂ خواتین ہیں۔ اور یہ نظام براہِ راست امیر جماعت کے ماتحت ہے۔ لیکن ہر مقامی حلقۂ خواتین اپنے کام کی رپورٹ قیمہ حلقۂ خواتین جماعت اسلامی پاکستان کے علاوہ اپنے ہاں کے مقامی جماعت کے دفتر کو بھی بھیجتا ہے اور مقامی جماعت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ اپنے ہاں کے حلقۂ خواتین کی ہر ممکن مدد کرے۔

جماعت کی موجودہ قوت

۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۶۳ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق جماعت اسلامی پاکستان کی موجودہ

قوت حسبِ ذیل ہے:

جماعت کے ارکان کی تعداد	= ۱۶۰۵	مشرقی پاکستان	= ۱۷۷
		مغربی پاکستان	= ۱۴۲۸
مقامی جماعتوں کی تعداد	= ۲۲۷	مشرقی پاکستان	= ۳۰
		مغربی پاکستان	= ۱۹۰
متفقین کی تعداد	= ۴۳۴۲۱	مشرقی پاکستان	= ۱۳۵۷۳
		مغربی پاکستان	= ۲۹۸۴۸
حلقہ ہائے متفقین کی تعداد	= ۱۵۶۲	مشرقی پاکستان	= ۵۸۱
		مغربی پاکستان	= ۹۸۱
دار المطالعوں اور جماعت کے لٹریچر اور دوسری دینی کتب کی لائبریریوں کی تعداد	= ۵۵۵	مشرقی پاکستان	= ۲۵۰
		مغربی پاکستان	= ۳۰۵
جماعت کے قائم کردہ شفاخانوں کی تعداد	۲۱	مشرقی پاکستان	= ۱۱
		مغربی پاکستان	= ۱۰

میت لے جانے کی گاڑی = ۱ (کراچی میں)
(یہ گاڑی کورنگی کالونی کی غریب آبادی کے لیے وقف ہے)۔

ان اعداد و شمار سے واضح ہے کہ اس وقت جماعت اسلامی کے پاس خدا کے فضل و کرم سے کارکنوں کی ایک ایسی ٹیم موجود ہے جن میں کم از کم سولہ سو مردانِ کار ایسے ہیں جو فرائض کے پابند، کبائر سے مجتنب، حرام و حلال کی تمیز کو اپنی پوری زندگی میں ملحوظ رکھنے والے اور دینِ حق کی اقامت کے لیے اپنی جان مال، وقت اور محنت کسی شے کی قربانی سے دریغ کرنے والے نہیں ہیں۔ اور چالیس ہزار سے زیادہ افراد ایسے ہیں جو بغیر کسی دنیوی غرض یا خوف کے صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر اقامتِ دین کی جدوجہد میں اپنے اوقات، محنت، سرمائے اور اپنے دوسرے ذرائع سے

نہ صرف جماعت کی مدد کر رہے ہیں بلکہ ملک کے اندر ۸۹۷ مقامات پر سرگرم عمل ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اخلاص دل کے ساتھ ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا خواہشمند ہے، اس کے قیام کے لیے جماعت اسلامی کے طریق کار، اس کے پروگرام اور پالیسی کو شرح صدر کے ساتھ صحیح مانتا ہے اور اپنی زندگی کو اسلام کے کم سے کم معیارِ مطلوب پر قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

یہ ۸۹۷ مقامی جماعتیں اور حلقہ ہائے متفقین جس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں اس کے موٹے موٹے اجزاء درج ذیل ہیں:

۱۔ اپنی بستیوں کی مسجدوں کی اصلاح۔

۲۔ عوام میں دین کا علم پھیلانے کی کوشش۔

۳۔ عام طور پر لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانے کی کوشش۔

۴۔ عوام کی اخلاقی اصلاح کے لیے سعی اور فواحش و منکرات کے سدباب کی کوشش۔

۵۔ قصبات و دیہات میں دار المطالعوں کا قیام۔

۶۔ ایسے پرائمری اور ہائی اسکول اور مذہبی تعلیم کے لیے مدرسے قائم کرنا جن میں تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کی بھی کوشش کی جائے۔

۷۔ دیہات میں عام لوگوں کے تعاون سے راستوں کی درستی اور صفائی اور حفظانِ صحت کی کوشش۔

۸۔ یتیموں، بیواؤں، معذوروں، بیماروں اور غریب طالب علموں کی جن جن طریقوں سے ممکن ہو مدد کرنا۔

اصلاحِ معاشرہ اور خدمتِ خلق کے اس پروگرام کے علاوہ تمام مقامی جماعتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک روز پابندی سے اپنا اجتماع کریں جس میں جماعت کے ارکان اور متفقین کے علاوہ بستی کے دوسرے لوگوں کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس اجتماع میں درسِ قرآن مجید، درسِ حدیث، سیرتِ پاک اور دوسرے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ اور ہفتہ بھر کی

خبروں کا خلاصہ اور ان پر مختصر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ عام باشندگانِ ملک کی ذہنی اور دینی و اخلاقی سطح بلند سے بلند تر ہو سکے۔ ان میں اجتماعی اور سیاسی شعور بیدار ہو اور ایک آزاد قوم کے افراد ہونے کی حیثیت سے ان کے اندر اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ اگرچہ حلقہ ہائے متفقین کے لیے لازم نہیں کہ وہ بھی لازماً ہفتہ وار اجتماع منعقد کریں، لیکن انہیں اس کی ترغیب دی جاتی ہے اور ان میں سے سینکڑوں پوری پابندی سے یہ اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔ کارکنوں کی اخلاقی اور دینی تربیت کے لیے جگہ جگہ تربیت گاہیں وقتاً فوقتاً قائم کی جاتی ہیں جن کا نظام اور نصاب شائع ہو چکا ہے۔ اور عوام میں بیداری پھیلانے کے لیے ہر مقام اور علاقے کی جماعتیں اپنی اپنی جگہ جلسہ ہائے عام، محلہ وار اجتماعات اور معززین کے اجلاس بھی منعقد کرتی ہیں۔ اس مختصر سے بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان قوم کی اخلاقی، دینی اور اجتماعی اصلاح کا کتنا عظیم الشان نظام ہے۔ اور جو لوگ اسے دوسری جماعتوں کی طرح کی ایک سیاسی یا روایتی مذہبی جماعت سمجھ کر اس کے کاموں میں حصہ لینے سے غفلت برت رہے ہیں یا محض ناواقفیت کی بنا پر کچھ پیشہ ور سیاسی اور مذہبی لوگوں کے باندھے ہوئے بہتانوں کی رو میں بہ جاتے ہیں وہ کتنی بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔

جماعتِ اسلامی نہ تو معروف اور محدود معنوں میں مذہبی جماعت ہے اور نہ عام سیاسی جماعتوں کی طرح کی سیاسی جماعت۔ یہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ایک اسلامی جماعت ہے جو انسانی زندگی کے پورے نظام کو خالصتہً اسلام کے اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ ہر جگہ، ہر میدان میں سرگرم عمل ہے۔ ملک کی آبادی کے ہر طبقے کو خطاب کر رہی ہے اور زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح و تعمیر کے لیے کوشاں ہے۔

اسلامی دستور کے لیے جماعت کا کام

اسی ہمہ گیر اصلاح کے پروگرام کا ایک حصہ نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے کوشش بھی ہے جو عرصۂ زیرِ رپورٹ میں جاری رہی ہے۔ عرصۂ زیرِ رپورٹ کے پہلے پندرہ سولہ مہینے بھی ملک کی

دستور سازی کی تاریخ میں شدید کشمکش کے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں جب ملک کا دستور بن کر بالکل تیار ہو گیا تھا اور دستور ساز اسمبلی میں آخری منظوری کے لیے اس کے پیش ہونے میں صرف چند روز باقی تھے، حتیٰ کہ اس کی تاریخِ نفاذ کا بھی اعلان کیا جا چکا تھا، عین اس وقت ملک کے سربراہ نے ۲۴ اکتوبر کی رات کو اچانک اسمبلی کو توڑ دیا اور پورے ملک میں مارشل لا کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ جماعت اسلامی کا نام لے لے کر اسے شدید ترین دھمکیاں دی گئیں لیکن اس سب کے باوجود جماعت اسلامی نے گورنر جنرل کے اس اقدام کو برملا چیلنج کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ گورنر جنرل کے اس اقدام کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی ہونی چاہیے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے بعد جو عدالتی چارہ جوئی ہوئی اس میں جماعتِ اسلامی کا کتنا حصہ تھا۔ اور اگر یہ چارہ جوئی نہ ہوتی تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اس ملک کا اب تک کیا حشر ہوا ہوتا۔

اس عدالتی چارہ جوئی کے نتیجہ میں نئی دستور ساز اسمبلی قائم ہوئی اور اس کا پہلا اجلاس جولائی ۱۹۵۵ء میں مری میں منعقد ہوا۔ جماعت اسلامی نے اس وقت فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ چنانچہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان نے دیکھا کہ راولپنڈی اور مری کے در و دیوار ہی نہیں، راولپنڈی سے مری تک ہر درخت اور ہر ٹیلہ ان سے اسلامی دستور کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہی نہیں، جماعت کے کارکنوں نے مری پہنچ کر دستور ساز اسمبلی کے تقریباً تمام سرکردہ ارکان سے یہ تحریری عہد لے لیا کہ وہ جو دستور بنائیں گے وہ پوری طرح اسلام کے اصولوں پر مبنی ہوگا اور اس میں نہ صرف سابق مسودۂ دستور کی تمام اسلامی اور جمہوری دفعات شامل ہوں گی بلکہ ان کو مزید بہتر بنایا جائے گا تاکہ ملک کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی دستور میسر آئے۔ اس کے علاوہ ان تمام اسلامی اور جمہوری دفعات کو مرتب کر کے ملک کی مختلف زبانوں میں شائع کر دیا گیا جو ۱۹۵۴ء والے دستور میں شامل تھیں۔ پھر جماعت کے نومبر ۱۹۵۵ء کے اجتماع میں ایک وسیع پروگرام بنا کر اسلامی دستور کے لیے ایک ملک گیر مہم شروع کر دی گئی جس کے ساتھ ملک کی دوسری دینی جماعتوں نے پورا تعاون کیا۔ پھر جب ۱۹۵۶ء کے دستور کا مسودہ شائع ہوا تو جماعت اور دوسری تھا۔ اور دینی جماعتوں کی اکثریت نے بالاتفاق ضروری ترمیمات مجلس دستور ساز کے روبرو پیش کر دیں

امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پورے ملک کا دورہ کیا اور مشرقی پاکستان جاکر وہاں سے بھی تقریباً پانچسو علماء کے اجتماع میں متفقہ ترامیم مرتب کرکے مجلسِ دستور ساز کو بھجوائیں۔ ان ساری کوششوں کے نتیجے میں ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو "اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور" کے نام سے ایک ایسا دستور پاس ہوگیا جسے بعض خامیوں اور اصلاح طلب پہلوؤں کے باوجود ملک کی عظیم اکثریت نے قبول کرلیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے یہ پاکستان کا دستور بن گیا۔

جماعت اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے بھی اسے اپنی قرارداد مؤرخہ ۱۸ مارچ ۱۹۵۶ء کے ذریعے اس کے اچھے اور خام پہلوؤں کی واضح طریق پر نشاندہی کرتے ہوئے قبول کرلیا۔

لیکن قبل اس کے کہ قوم کو نئے دستور کے تحت انتخابات کا موقع ملتا اور اس کے منتخب نمائندے دستور کو عملی جامہ پہناتے (حالانکہ انتخابات کے لیے تاریخ بھی مقرر کی جاچکی تھی) ۸ اکتوبر ۵۸ء کو یکایک ملک میں مارشل لا نافذ کردیا گیا، دستور کو اُسی صدر نے توڑ دیا جو دستور کی وفاداری کا حلف اٹھاکر دستور کے تحت صدر بنایا گیا تھا، پارلیمنٹ برخاست کردی گئی اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو جن میں جماعت اسلامی بھی شامل تھی، ممنوع قرار دے دیا گیا۔

زمانۂ تعطّل

اس واقعہ کے بعد ۴۴ مہینے ایسے گزرے ہیں جن میں جماعت اسلامی کالعدم رہی ہے، اس لیے ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء تک کا زمانہ جماعت کی تاریخ سے خارج ہے اور اس میں کوئی جماعتی کام نہیں ہوا ہے جس کی رُوداد یہاں پیش کی جاسکے۔ پونے چار سال کے اس طویل زمانۂ تعطّل میں جو واقعات ملک میں پیش آئے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

مارشل لا کی حالت میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ۱۹۵۹ء میں بنیادی جمہوریتوں کا ایک نیا نظام قائم کیا اور ایسی حالت میں ان جمہوریتوں کے انتخابات کرائے جبکہ ملک میں سیاسی پارٹیاں ممنوع اور ہر قسم کی سیاسی سرگرمی جرم تھی۔

پھر فروری سنہ ۶۰ء میں انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کے ۸۰ ہزار منتخب نمائندوں سے اپنے لیے صدارت کا ووٹ طلب کیا اور ساتھ ساتھ یہ اختیار بھی مانگا کہ وہ ملک کے لیے جو دستور چاہیں بنا دیں۔ اس انتخابِ صدارت میں کوئی دوسرا امیدوار نہ تھا۔ اور رائے دہندوں کے سامنے یہ بات بھی واضح نہ کی گئی تھی کہ اگر وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اس دوگونہ مطالبہ کا جواب نفی میں دیں تو کیا ہوگا؟ عام تاثر یہی تھا کہ اس صورت میں مارشل لاء ہی ملک کا دستور رہے گا۔

صدر منتخب ہو جانے اور دستور سازی کے کلی اختیارات لینے کے بعد فروری سنہ ۶۰ء میں نئے صدر نے ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ دستور سازی کے معاملہ میں ان کو مشورہ دے۔ اس کمیشن نے ایک سوال نامہ جاری کر کے عوام کی رائے طلب کی۔ مگر دستوری مسائل پر بحث و مشاورت کرنے کے لیے پریس اور پلیٹ فارم کے دروازے لوگوں پر بند رہے تاکہ لوگ صرف انفرادی طور پر ہی کمیشن کے سوالات متفرق طریقے سے دیں اور کوئی اجتماعی رائے نہ بننے پائے۔ جن لوگوں نے کمیشن کے سوال نامے کے جوابات مرتب کر کے شائع کر دیئے تھے ان میں سے بعض کو سخت بازپرس سے سابقہ پیش آیا۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ اپریل سنہ ۶۱ء میں پیش کر دی، لیکن صدر نے خود اپنے نامزد کردہ کمیشن کی رپورٹ کو بھی قبول نہ کیا اور مارچ سنہ ۶۲ء میں خود ایک دستور بنا کر ملک میں نافذ کر دیا نئے دستور کے نفاذ کے بعد بھی ملک میں اس وقت تک مارشل لاء نافذ رہا جب تک اس دستور کے تحت بنیادی جمہوریتوں کے ذریعہ سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مکمل نہ ہوگئے اور قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد نہ ہوگیا۔ یہ انتخابات مارشل لاء کی حالت میں کرائے گئے جبکہ سیاسی پارٹیاں بدستور ممنوع تھیں اور انفرادی امیدواروں کی طرف سے کسی انتخابی منشور کا پیش کیا جانا بے معنی تھا۔

جون سنہ ۶۲ء میں قومی اسمبلی وجود میں آئی۔ اس کا پہلا اجلاس منعقد ہونے کے ساتھ ہی ملک سے مارشل لاء اٹھ گیا۔ پھر اسمبلی نے جولائی سنہ ۶۲ء میں سیاسی پارٹیوں کا نیا قانون منظور کیا جس کے بعد پارٹیوں کے از سر نو وجود میں آنے کا امکان پیدا ہوا۔

۱۶ جولائی کو امیر جماعت نے جماعت اسلامی کی بحالی کا اعلان کیا اور الحمدللہ کہ ۴۸ گھنٹے کے اندر تمام ملک میں جماعت کی تنظیم از سرِ نو قائم ہوگئی۔

زندگیٔ نو

اس طرح ہماری رپورٹ کا سلسلہ نئے سرے سے ۱۶ جولائی ۶۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ امیر جماعت کے اعلان کے بعد ۱۰ اگست ۶۳ء کو جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ لاہور میں مجتمع ہوئی اور ملک کے نئے دستور کے متعلق ایک قرارداد کی صورت میں اس نے جماعت کا نقطۂ نظر واضح کیا۔ اس قرارداد میں مجلسِ شوریٰ نے سنہ ۱۹۶۲ء کے دستور کے صریحاً غیر اسلامی اور غیر جمہوری پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کے بعد یہ قرار دیا کہ "ان وجوہ سے یہ دستور حقیقت میں تو قابلِ قبول نہ تھا لیکن بحالاتِ موجودہ مجلسِ شوریٰ کی رائے میں اسے برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ اس کی جگہ اگر نیا دستور بنوانے کی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ ملک میں جمہوریت کے رہے سہے امکانات کو بھی ختم کر دینے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اس لیے یہ مجلس خوب سوچ سمجھ کر اس رائے پر پہنچی ہے کہ اسی دستور کو بتدریج تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے تمام جمہوریت پسند عناصر ایک دوسرے سے تعاون کرکے پہلے ان دستوری و قانونی رکاوٹوں کو دور کرائیں جن کی موجودگی میں ملک کے اندر کوئی مؤثر سیاسی جدوجہد نہیں ہو سکتی اور پھر دستور میں رفتہ رفتہ ایسی ترمیمات کرائیں جن سے یہ کم از کم صدارتی طرز ہی کا جمہوری دستور بن جائے۔۔"

اس سلسلے میں جماعت کے نزدیک سب سے پہلے دو تبدیلیاں نہایت ضروری ہیں۔ ایک بنیادی حقوق کی بحالی۔ دوسرے رائے دہندگی بالغان کے ذریعہ سے براہِ راست انتخابات۔ کیونکہ جب تک پہلی چیز نہ ہو، ملک میں اصلاحِ احوال کے لیے کوئی آزادانہ جدوجہد نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک دوسری چیز نہ ہو جمہوری و آئینی ذرائع سے دستور و قانون میں کوئی تغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی بنا پر جماعت اس اجتماع میں اپنی سیاسی جدوجہد انہی دونوں امور پر مرکوز کرنے کا فیصلہ کر رہی ہے۔

جوابی مضمون

[یہ مضمون ایرانی سفارت خانہ کراچی کی طرف سے اس مضمون کے جواب میں وصول ہوا ہے جو ماہ اکتوبر ۶۳ء کے ترجمان القرآن میں جناب خلیل حامدی صاحب کے قلم سے "ایران میں دین اور لادینی کی کشمکش" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ہم نے جس طرح خلیل حامدی صاحب کا مضمون ان صفحات میں درج کیا تھا۔ اسی طرح ہم ڈاکٹر محمد علی زرنگار صاحب وابستہ مطبوعاتی سفارت کبرائے شاہنشاہی ایران کا جوابی مقالہ بھی یہاں شائع کر رہے ہیں۔ اسلام کے رشتے سے ایرانی ہمارے اسی طرح بھائی ہیں جس طرح پاکستانی۔ اور مملکت ایران ہم کو اسی طرح عزیز ہے جس طرح مملکت پاکستان۔ ہمیں کسی مملکت کے بارے میں کوئی ایسی بات شائع کرنے سے خوشی نہیں ہوتی جو اس کے لیے بدنامی کی موجب ہو۔ خلیل حامدی صاحب کے مضمون کی اشاعت سے پہلے بھی ہم نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ اس میں جو معلومات درج کی گئی ہیں وہ سب ایران اور عراق کے معتمد علماء کے شائع شدہ مضامین سے ماخوذ ہیں۔ اب یہ جوابی مضمون بھی ہم اس لیے شائع کر رہے ہیں کہ یہ سفارت خانے کی طرف سے ایک ذمہ دارانہ بیان ہے۔ ادارہ]

تمام دنیا شاہد ہے کہ ایران میں سیاسی اور اقتصادی ثبات موجود ہے۔ ملتِ ایران اپنے محبوب شاہنشاہ کے ظلِ عاطفت ان کی عاقلانہ راہنمائی اور قانونِ اساسی کے سایے میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور ملک میں ہر طرح سے امن و امان ہے۔ ایران میں جو آزادی ہے وہ دنیا کے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک کی آزادی سے کسی طرح کم نہیں ہے اور ایران دینِ مبین کے اصولوں پر کاربند ہے۔ حامدی صاحب نے مقالے کے شروع میں جو کچھ لکھا ہے وہ تعصب، خود بینی، عدم

واقفیت اور حقیقت سے چشم پوشی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل جوابات سے حقیقی واقعات کافی روشن ہو جائیں گے۔

۱۔ ایران کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالت سابقہ حالت سے کہیں بہتر ہے اور ملتِ ایران بلا استثناء تمام اصلاحاتی اور عمرانی اور ترقیاتی منصوبوں میں ساعی و کوشاں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ ترقیاتی منصوبوں سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ نہ کسی خاص طبقے کی ملکیت ہے اور نہ کسی ایک شخص کی، بلکہ ملتِ ایران اس کی مالک ہے اور وہ قوم کا سرمایہ ہے۔ قابل مصنف نے مقالہ تو لکھ مارا لیکن ان حضرت کو یہ بھی خبر نہیں کہ ریڈیو ایران کسی ایک شخص یا چند اشخاص کی ملکیت نہیں ہے بلکہ یہ ایک سرکاری ادارہ ہے جو عوام کے خیالات کو منعکس کرتا ہے

۲۔ تعجب ہے کہ ایران کی اخلاقی حالت کے بارے میں مصنف نے یا ان کے قول کے مطابق عراق اور ایران کے ان علماء نے جنہوں نے حامدی صاحب کو یہ اطلاعات پہنچائی ہیں کس طرح اندازہ لگا لیا۔ اگر واقعی ایران کے علماء بھی اس میں شریک ہیں تو ایرانی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی ان اخلاق پسماندگان کے زمرے میں شامل ہیں۔ ایک طرف تو ایران کے اخلاقی فقدان کا رونا ہے اور دوسری طرف دنیا بھر کی متمدن اور ترقی یافتہ قومیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ ایرانی مرد اور عورت حُسنِ اخلاق اور دانائی کا مجسّم نمونہ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ان ہزاروں پاکستانی بھائیوں میں سے جو ہر سال مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے یا سیاحت کے لیے یا تجارت یا کام کی تلاش میں ایران آتے جاتے رہتے ہیں چند اشخاص سے اہلِ ایران کی اخلاقی حالت اور پابندی مذہب کے متعلق دریافت کر لیتے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہزاروں برس سے ایران میں اخلاق کا بنیادی اصول "گفتار نیک ۔ پندار نیک ۔ کردار نیک" رہا ہے ۔

۳۔ ملتِ ایران فقیر و نادار نہیں ہے ۔ بلکہ مادی اور معنوی ثروت کے لحاظ سے یہ ملت دوسری قوموں کے لیے موجبِ رشک ہے ۔ یہ ملت دیندار ۔ شاہ پرست اور ترقی خواہ ہے اور کوئی طاقت اس کے پاک احساسات کو ملوث نہیں کر سکتی ۔

۴- تجارت کے متعلق یہ ہے کہ تجارت کسی ایک شخص یا ایک گروہ کا اجارہ نہیں ہے - ایرانی تجار ملک کی تجارت کو فروغ دینے میں کوشاں ہیں - ان کو آزادیٔ عمل حاصل ہے - ایران کے تجارتی تعلقات تمام ممالک سے ہیں اور یہی حقیقت ایران کے اقتصادی رشد کا پتہ دیتی ہے - رہا سوال اسرائیل کا، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایران نے سرکاری طور پر اسرائیل کو شناخت نہیں کیا ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی نمائندوں کا مبادلہ نہیں ہوا ہے -

۵- یہ صحیح ہے کہ ایران میں علماء کو قومی رہنما اور مشاور کا درجہ حاصل ہے اور وہ قوم کے دوش بدوش زمانے کے اقتضا کے مطابق ترقی کی دوڑ میں شریک ہیں اور شاہنشاہ کی جاری کردہ اصلاحات میں قوم کی مدد کرتے ہیں۔ "قم" کا مقدس شہر اسلامی تعلیم کا مرکز ہے اور اس کی مذکورہ حیثیت میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے - شاہنشاہ، حکومت اور ملت اس مقدس مقام کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں-

تازہ واقعات | ۱- جمادی الاول میں علم کا بینہ نے قانون انتخابات میں جو ترمیمات اور اصلاحات منظور کیں وہ دستور اساسی کے عین مطابق تھیں - شاہنشاہ کی جاری کردہ اصلاحات کو قوم کے ساٹھ لاکھ بالغ افراد نے منظور کر لیا تھا - قرآن مجید کے متعلق عرض ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور قرآن ہمیشہ قرآن ہی رہے گا -

۲- عورتوں کے انتخابات اور حق رائے دہندگی کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ قانونِ اساسی اور دینِ مبین اسلام میں مردوں اور عورتوں کے حقوق برابر ہیں - جب خداوند تعالیٰ کے سامنے مرد اور عورت مساوی ہیں تو شاہنشاہ نے عورتوں کو یہ حق دے کر کونسا گناہ کیا ہے -

۳- قانون اساسی کی رو سے ایران میں اقلیت کے ہر فرقے کا ایک نمائندہ مجلسِ ملی میں لیا جاتا ہے - اس بارے میں بھی مصنف کی اطلاعات مکمل نہیں ہیں - اس قانون کی مخالفت نہ ہی علما کرتے ہیں اور نہ ہی سیاسی اور سماجی حلقوں میں اس کی مخالفت کی جاتی ہے بلکہ وہاں تو اس کی حمایت ہوتی ہے - قارئین کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اب سے ۵۵ سال پہلے جب آزادی اور آئینی قانون سے متعلق تحریک شروع ہوئی تو علماء ہی پیش پیش تھے اور

قانونِ اساسی کی تدوین وتالیف میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ اتہام کہ بہت سے علماء قید میں ہیں غلط ہے۔
جب یہ بل پاس ہوا ہے تو آقای علم نے کسی کو قید نہیں کیا بلکہ قوم کو پہلے سے زیادہ آزادی عطا کر دی
پاکستان میں بھی جو ایک اسلامی ملک ہے عورتوں کو اپنی قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل
ہے۔ ان کو ووٹ دینے کا ہی نہیں بلکہ انتخابات میں کھڑے ہونے کا حق بھی حاصل ہے۔ چنانچہ پاکستان
کی قومی اسمبلی میں عورتیں ممبر ہیں۔ پاکستان میں مخلوط انتخابات ہوتے ہیں اور ہر مذہب وملت کے
لوگ مخلوط طریقے پر ووٹ دیتے ہیں۔ لیکن ایران میں ایسا نہیں ہوتا۔ اقلیت کا ہر فرقہ الگ
الگ ووٹ دیتا ہے اور ان کا نمایندہ مجلس میں ہوتا ہے۔

شاہنشاہ کی مداخلت | افسوس کا مقام ہے کہ اس مقالے کے مصنف اور ان لوگوں نے جنھوں نے
یہ اطلاعات مصنف کو بہم پہنچائی ہیں اپنی بے اطلاعی اور عدمِ واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ پارلیمنٹ
کی عدم موجودگی میں آئین کے مطابق شاہنشاہ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ قانونِ اساسی کا اجرا کریں۔
یہ حق ۵۵ سال پہلے اپنے قانون اساسی کے مطابق قوم نے اپنے ملک کے سربراہ کو دے دیا تھا
اور ایران کے بادشاہ عدل وانصاف کے ساتھ جمہوریت کے اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے اپنے
ملک کی کشتی کو طوفان انگیز سمندروں میں سے نکال کر نجات کے ساحل پر لاتے رہے ہیں اور ملتِ
ایران جوان کی بے حد ممنون ہے ہمیشہ اپنے شاہنشاہ کے لیے جان ومال کی قربانی دینے پر آمادہ
رہی ہے اور بارہا اس نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔ جو لوگ ملک کی آزادی، ترقی اور
سالمیت کے خلاف سر اٹھائیں یا فتویٰ دیں ملتِ ایران ان کو اپنے میں سے نہیں سمجھتی۔

ردِ عمل | مصنف نے جو ردِ عمل کی توضیح کی ہے صحیح نہیں ہے۔ ایرانی قوم کے افراد نے خواہ وہ
ایران میں ہوں یا کسی غیر ملک میں شاہنشاہ کی چھ نکاتی اصلاحات کی حمایت کی ہے۔

ظلم وستم | چند لوگوں کی طرف سے مخالفت اور مظاہرے اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ لوگوں
کی اکثریت شاہنشاہ کی جاری کردہ اصلاحات کے مخالف ہے۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو گمراہ ہو
جاتے ہیں اور غیر ملکیوں کے ہاتھ میں آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ مصنف کا یہ کہنا کہ قم میں بہت سے

علما اور زعما کو قید کر رکھا ہے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

علما کی مخالفت | یہ بات مکرر لکھنی پڑ رہی ہے کہ حامدی صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات بالکل بے معنی اور سراسر جھوٹ ہیں۔ اور اگر دو چار آدمی مخالف بھی ہوں تو ان کو تمام علما کے نام سے مخاطب نہیں کیا جا سکتا۔ آیا حامدی صاحب کو معلوم ہے کہ ایران میں علما کی تعداد تیس ہزار سے زائد ہے۔ اور یہ لوگ ملت ایران کے رہنما ہیں۔ اور اگر ان میں سے تین چار آدمی جن کو ایران کے دشمنوں سے مدد ملتی رہی ہے علمِ مخالفت بلند کریں تو ان کی وجہ سے تمام علما کے طبقے کو مطعون اور بدنام نہیں کیا جا سکتا۔ ایران میں عوام ہی نہیں بلکہ شاہنشاہ اور حکومت بھی علما کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔

حکومت کا عمل | مصنف کا یہ کہنا کہ شاہنشاہ کی بلائی ہوئی کسانوں اور مزدوروں کی کانفرنس میں کسی نے اصلاحاتی پروگرام کی طرف توجہ نہیں دی، سفید جھوٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اطلاع دینے والوں کے آنکھ اور کان بند تھے۔ اور جو لوگ عورتوں کی آزادی کو خلافِ مذہب قرار دیتے ہیں وہ بدطینت، پسماندہ اور خود غرض ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ تمام اسلامی ممالک میں یہ حقوق پہلے ہی دیئے جا چکے ہیں۔

استصواب رائے | ۲۶ شعبان کو ملتِ ایران نے شاہنشاہ کی پیش کردہ اصلاحات کو تقریباً باتفاق آرا منظور کر لیا۔ حقیقت میں یہ ایران کے ساٹھ لاکھ نفوس کی طرف سے دشمنوں اور ان کے پٹھوؤں اور آزادی کے دشمنوں کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔ کیا آپ ان لوگوں کو مسلمان اور وطن پرست کہیں گے جنہوں نے مدرسے کے بچوں کی بسوں۔ لڑکیوں کی بسوں اور قومی لائبریری کو آگ لگا دی۔ لوگوں کی موٹروں کو جلا ڈالا۔ عورتوں اور بچوں پر حملے کیے۔ پولیس کے افراد کو زخمی اور قتل کیا۔ سرکاری عمارات کو نذرِ آتش کر دیا۔ کونسا ایسا ظلم تھا جو انہوں نے نہیں کیا۔ مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ ایران کی دو کروڑ آبادی میں سے چند لاکھ افراد نے استصواب رائے میں شرکت کی۔ مصنف کو معلوم ہو کہ اصلاحات کے حق میں رائے دینے والوں کی تعداد ساٹھ لاکھ تھی۔

ظلم کی انتہا | قم کے حادثے کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ مصنف کے تعصب اور

عدم واقفیت پر مبنی ہے ۔ نیز مشہد میں گرفتار ہونے والے علماء کے متعلق جو خبر درج کی گئی ہے وہ بے معنی اور بے بنیاد ہے۔

ایران میں علماء کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور شخص کو نہیں ۔ خاص و عام سب ان کا احترام اور عزت کرتے ہیں ان کو عمل کی پوری پوری آزادی حاصل ہے اور رہے گی ۔ ان میں سے اس وقت کوئی بھی قید میں نہیں ہے ۔ ایران اس وقت اپنے عادل اور عاقل شاہنشاہ کی رہنمائی میں روز بروز ترقی کی طرف قدم اٹھا رہا ہے اور اس نے دنیا کے مترقی ممالک میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔ پارلیمنٹ نے پوری آزادی کے ساتھ عزم گورنمنٹ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے اور اس کے تمام اقدامات کو منظور کر لیا ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ جاری شدہ اصلاحات کو حکومت کی پوری پوری حمایت حاصل ہے ۔

مطبوعات

روح القرآن: از: اچاریہ ونوبا بھاوے جی۔ ناشر: سکرٹری اکھل بھارت سرو سیوا سنگھ پرکاشن راج گھاٹ کاشی قیمت ۴ روپے۔

قرآن مجید کا یہ انتخاب بھارت کے مشہور سماجی رہنما گاندھی جی کے جانشین اور بھودان تحریک کے بانی و علمبردار ونوبا بھاوے جی نے تیار کیا ہے۔ اس انتخاب میں ۱۰۶۵ آیتیں شامل ہیں۔ کتاب کے ۹ حصے ہیں جو ۲۰ ابواب پر مشتمل ہیں۔ ہر باب کے تحت فصلیں ہیں جن کی تعداد ۹۰ ہے۔ ان کے ذیل میں ۴۰۰ عنوانات ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے جس میں قرآنی الفاظ و اصطلاحات کے معنی و مفہوم کو متعین کیا گیا ہے۔

آیات کا ترجمہ ونوبا بھاوے جی کے پرانے عقیدت مند شری اچیت دیش پانڈے نے کیا ہے اور اس فرض کی بجا آوری میں انہوں نے قرآن پاک کے مشہور اردو اور انگریزی تراجم اور تفاسیر سے استفادہ کیا ہے۔ یہ انتخاب فی الحال صرف دو زبانوں (اردو اور انگریزی) میں بلا متن شائع ہوا ہے لیکن ناشرین کا کہنا ہے کہ وہ اسے عنقریب ہندوستان کی تمام زبانوں میں شائع کریں گے۔

قرآن مجید کی جو شخص بھی خلوص نیت سے خدمت کرتا ہے وہ انسانیت کی طرف سے مبارکباد کا مستحق ہے۔ اسی بنا پر ہم ونوبا بھاوے کی اس سعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے جو چیز ہمیں بار بار کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس انتخاب میں قرآنی تعلیمات کی روح کو کشید نہیں کیا بلکہ اپنے ذاتی تصورات اور پسندیدہ نظریات کو سامنے رکھ کر قرآن مجید کا ایک ملخص پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اُن کے نظریات میں سب سے اہم اور بنیادی نظریہ وحدتِ ادیان ہے جسے انہوں نے اپنے رہنما گاندھی جی سے حاصل کیا ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ سارے مذاہب یکساں برحق ہیں اور کسی ایک مذہب کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اسی طرح دنیا کی کوئی اُمت ایسی نہیں جو "اُمت وسط" کی حیثیت سے دوسری اُمتوں اور ملتوں پر اپنی برتری کا دعویٰ کرے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس عقیدہ کا اظہار مقدمہ میں بھی کیا ہے:

"سائنس نے دنیا چھوٹی بنائی اور سب انسانوں کو نزدیک لانا چاہتا ہے ایسی حالت میں انسانی تاریخ فرقوں میں تقسیم ہے۔ ہر جماعت اپنے آپ کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھے۔ یہ کیسے چلیگا نفرت۔"

ظاہر بات ہے کہ جب کوئی شخص اس بنیادی نظریہ کو، جو قرآنی تعلیمات سے مختلف ہے، لیکر قرآن مجید کا انتخاب کریگا تو وہ اس کی حقیقی روح کو سمجھنے اور سمجھانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیگا۔ اور یہی چیز ہمیں اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ انہوں نے اسلام کی جو تعریف کی ہے اُس میں اللہ پر ایمان لانا اور اس پر مستحکم رہنا کہا ہے۔ اسی طرح ایمان میں یقین، تصدیق، اعتقاد، ہوائے نفس کو اللہ کے تابع کرنے کا مفہوم شامل کیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے جس چیز کو اسلام اور ایمان سے تعبیر کیا ہے اس میں رسالت، آخرت، کتبِ سماوی اور ملائکہ پر ایمان بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۔ (النساء - ۱۹)	اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دُور نکل گیا۔

اس انتخاب میں عقیدۂ رسالت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے والی آیتیں کافی تعداد میں موجود ہیں لیکن اُن آیات کو معلوم نہیں کس احساس کے تحت نظر انداز کر دیا گیا ہے جس میں رسالت محمدی کی امتیازی خصوصیات بیان ہوتی ہیں: مثلاً سورۂ احزاب کی آیت:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ہیں اور سلسلۂ نبوت کے ختم کرنے والے

اسی طرح ان اوراق میں وہ آیات تو نظر آتی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں، ایمان والے سب ایک امت ہیں، کسی کے معبود کو بُرا نہ کہو، بحث میں موافقت تلاش کرو، بہشت کسی کی میراث نہیں لیکن وہ آیات یکسر غائب ہیں جن میں اس امر کا واضح اعلان ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے،

اور جو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے ضابطۂ حیات، یا مذہب کی پیروی کرتا ہے وہ جادۂ مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۲)	اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ (آل عمران۔ رکوع ۱۱)	اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔
اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ۔ ۱)	آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو۔ بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

پھر یہ چیز بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ونوبا بھاوے جی نے توحید، اثبات اور ردِ شرک کے لیے بہت سی آیات کو جمع کرتے وقت اُن آیات کو چھوڑ دیا ہے جن میں اصنام یا اوثان کے الفاظ موجود ہیں۔

آیات کا ترجمہ بھی اغلاط سے خالی نہیں اور بعض آیات کا مفہوم اپنے ذوق کے مطابق معین کرنے کی وجہ سے عجیب و غریب ہو گیا ہے۔

یہی انتخاب انگریزی میں THE ESSENCE OF QURN کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک چیز اردو سے مختلف ہے کہ اس میں آغاز میں اُن ساری آیات کی فہرست درج کر دی گئی ہے جو اس انتخاب میں شامل ہیں۔ البتہ اس میں فرہنگ نظر نہیں آتی جو اردو میں موجود ہے۔

(بقیہ اشارات)

نقصان پہنچایا تھا تو کیا وہ حق کا خون نہ کرے گا؟

قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان سے جتنی غیر معمولی محبت ہو سکتی تھی کیا اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے؟ وہ اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور انہیں کی قیادت اور سربراہی میں یہ تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ۱۹۴۰ء سے پہلے تک وہ تقسیم ملک کے تخیل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور انہوں نے بدرجۂ آخر اس نصب العین کو ابنائے وطن کی مسلسل عیاریوں سے مجبور ہو کر اپنایا۔ اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں وہ سالہا سال تک کانگریس کے ہمنوا رہے۔ پھر اس سے الگ ہونے کے بعد بھی اس جماعت کی احسان فراموشی، تنگ دلی اور ہندوانہ ذہنیت کو جاننے کے باوجود مدتوں اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ مسلمانوں کے لیے چند تحفظات منظور ہو جائیں تو وہ دل وجان سے کانگریس کے ساتھ مل کر آزادئ وطن کا متحدہ محاذ قائم کریں حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ مخلوط انتخاب تک کو بعض شرائط کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے تاکہ کسی نہ کسی طرح کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ ہو جاتے اور آزادئ ہند کے لیے اس سے مل کر جدوجہد کی جا سکے۔ ۷ رفروری ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا تھا:

> "میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ بھی اس رواداری اور اسی مصالحت کا سلوک کیجیے۔ ہمارا ہاتھ حاضر ہے۔ یہ دوستی اور اخوت کا ہاتھ ہے آپ بھی اپنا ہاتھ بڑھائیے ہم اتحاد کے لیے بالکل تیار ہیں" (اقبال کے آخری دو سال ص ۴۴)

قائداعظم کی ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہ زبردست خواہش ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر حکومت مغربی پاکستان کے ایک وزیر جناب عبدالوحید خاں صاحب نے اپنی کتاب "تقسیم ہند" میں اس امر کی پوری وضاحت فرمائی ہے۔ یہاں ہم اس کے چند اقتباسات

پیش کرتے ہیں:

"مسٹر جناح مسلم لیگ کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ضرور چاہتے تھے لیکن وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اس دور انتشار میں بھی کوشاں رہے۔ وہ فرقہ وارانہ اختلافات کے خلاف تھے اور جداگانہ انتخاب کو بھی ایک عارضی اور عبوری علاج سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی ممبری سے رولٹ بل کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفا دے چکے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے انڈین ریفارم بل کے سلسلے میں پارلیمنٹ کی مقرر کردہ جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے اپنے ایک مفصل اور مدلل بیان میں اس امر کی شہادت دی تھی[1] کہ:

"میں مسلمانوں کے لیے کسی خاص رعایت کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ مجھ سے زیادہ کوئی آدمی اس وقت خوش نہ ہوگا جب وہ دن آئے کہ ہندو مسلم حقوق کے امتیاز کو بالکل ختم کر دیا جائے اور مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی کا سوال ختم ہو جائے"

(پارٹیشن آف انڈیا از بی۔ آر امبیدکر ص ۳۰۹)

"گول میز کانفرس میں مسٹر جناح نے آخر وقت تک لیگ اور کانگرس سمجھوتے کی کوشش کی مگر ناکام ہوتے۔ مسلمان بجائے پچیس فی صد کے اپنے لیے ۳۳ فیصدی تناسب مرکزی اسمبلی میں چاہتے تھے مگر کانگرسی لیڈروں نے ہندو مہا سبھا کے لیڈروں کو سامنے لا کر ان کی آڑ لی اور مسلمانوں کا کوئی مطالبہ نہیں مانا۔"

کانگرس کی ان تمام بے اعتنائیوں کے باوجود مسلم لیگ نے پھر ۳۷-۱۹۳۶ء کے عام انتخابات میں کانگرس کے ساتھ پورا اشتراک کیا لیکن جیسے ہی کانگرس انتخابات میں کامیاب ہوگئی اس نے پھر مسلم لیگ کے اتحاد کی پیش کش کو مسترد کر دیا۔

اس دور میں بھی جبکہ حسرت موہانی ظفر علی خاں اور علی برادران کانگرس سے مایوس ہو چکے تھے اور نہرو رپورٹ اور گول میز کانفرنس کے بعد تمام امیدیں منقطع کر چکے تھے، مسٹر جناح، گاندھی اور

---

[1] ص ۱۰۱

جواہر لال سے صلح کی اُمید لگاتے رہے اور جیسے ہی جواہر لال نہرو نے متکبرانہ انداز میں مسلم لیگ کا دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا تو انہوں نے مہاتما گاندھی سے اپیل کی کہ وہ مداخلت کر کے دونوں پارٹیوں میں صلح کرا دیں۔ لیکن گاندھی جی نے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔"

(تقسیم ہند ص ۱۰۳، ۱۰۴)

یہی نہیں بلکہ قائداعظم نے تقسیم ملک سے تھوڑی مدت پہلے تک اپنی طرف سے اس امر کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح کانگرس کے ساتھ اُن کا سمجھوتہ ہو جائے۔ اور اس کوشش میں وہ یہاں تک گئے کہ انہوں نے کیبنٹ مشن پلان قبول کر لیا تھا، حالانکہ اس وقت وہ خود بھی اور ہندوستان کے قریب قریب سارے ہی مسلمان کانگرس کے معاندانہ رویہ سے سخت مایوس تھے۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب عبدالوحید خاں صاحب فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ کا ایک زبردست عنصر مسلم لیگ کونسل کے اس فیصلے پر مایوس تھا جس میں کیبنٹ مشن پلان منظور کیا گیا تھا۔ لیکن کیونکہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں کی یہ خواہش تھی کہ اس طویل اور پریشان کن مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کیا جائے اور کانگرس کے لیڈروں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے اس لیے انہوں نے پلان کو منظور کرنا مناسب سمجھا۔ کونسل نے اُن کے مشورہ کو قبول کیا اور ان لوگوں کو جو ہندوستان کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے حصولِ آزادی کے حق میں تھے ایک موقع دیا۔ اگرچہ اس سے کانگرس کی تنگ نظری اور ضد کی بنا پر کچھ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا . . . . مسٹر جناح کے اس اصرار کے باوجود کہ لیگ کا فیصلہ کونسل کا فیصلہ تھا فطری طور سے اور صحیح طور سے یہ سمجھا گیا کہ یہ اسی کا فیصلہ تھا۔ جس طرح گزشتہ چھینے میں شملہ میں اُنہوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک تعمیری اور اثباتی اقدام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح اس فیصلے سے انہوں نے پھر ایک مرتبہ اپنے نکتہ چینیوں کو حیرت میں ڈال دیا جو اُن کے خلاف یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ ہر اُس تجویز کو جو اس کی ایک مبہم اور غیر واضح اور ناقابلِ عمل پاکستان کے نقطۂ نظر سے کم ہو مسترد

کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ آئینی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ شملہ کی طرح انہوں نے یہاں بھی اسی اصول پر عمل کیا تھا کہ اپنے بنیادی عقیدے کو چھوڑے بغیر مخالف نقطۂ نظر کی رعایت ملحوظ رکھی جائے۔ ان کے مخالفین نے بلاشبہ ان ابہامات اور چھپے ہوئے نکتوں کی طرف اشارہ کیا جو مسلم لیگ کے ریزولیوشن میں موجود تھے اور پوچھا کہ آیا ان سب کا مجموعی اثر اسکیم کی منظوری کو دراصل کالعدم کر دینے کے لیے کافی ہے یا نہیں لیکن کچھ قدامت پرست مسلمان ایسے بھی تھے جن کے لیے یہ تجویز حد سے زیادہ مصالحت آمیز تھی۔ کلکتہ کے مارننگ نیوز نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یا تو یہ نعرہ تھا کہ پاکستان یا موت اور اب نہ ہی پاکستان ہے اور نہ موت بلکہ اول الذکر کی تبدیلی اور موخر الذکر کی تیاری"۔ (ص ۲۴۵ تا ۲۴۷)

قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے بارے میں حکومت مغربی پاکستان کے ایک وزیر باتدبیر کی یہ توضیحات گہرے غور و فکر کی محتاج ہیں۔ یہ اقتباسات کافی طویل ہو گئے ہیں لیکن ہم نے انہیں یہاں اس لیے نقل کیا ہے تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس اصول کے تحت آج مولانا مودودی کو ملک و ملت کا دشمن قرار دیا جا رہا ہے اس کی اثر آفرینیوں سے تو کوئی محترم ہستی بھی نہیں بچ سکتی۔ آپ اگر کسی رہنما کے نظریات میں وقت کے حالات اور تاریخی پس منظر اور ارتقاء کے فطری عمل کو نظر انداز کر کے سلسلے کی صرف ایک کڑی کو لیکر کوئی فیصلہ کر ڈالتے ہیں تو یہ اس کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔ مسٹر جناح کی پاکستان دوستی کے بارے میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن آج اگر کوئی شخص مرحوم کی ۱۹۰۶ء کی کسی تقریر کی بنیاد پر یہ کہنا شروع کر دے کہ وہ متحدہ ہندوستان کے علمبردار تھے تو یہ سخت ناانصافی ہو گی۔

ان کے فکری ارتقاء کی معقول توجیہ یہی کی جا سکتی ہے کہ قائداعظم ایک انصاف پسند خادم ملت تھے۔ ملت کو فلاح و کامرانی کی منزل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اس مقصد کے لیے کبھی انہوں نے حالات کے پیش نظر ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کی اور کبھی مسلم قوم کے لیے ایک آزاد خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا۔ اس کشمکش میں انہیں مختلف مراحل میں سے گزرنا پڑا اور ہر مرحلہ پر انہوں نے ملک و

قوم کے مجموعی مفاد کو سامنے رکھ کر مختلف فیصلے کیے مختلف اوقات میں ان فیصلوں کے اندر کافی اختلاف بھی رہا لیکن ان سب کے پیچھے ایک مقصد اور جذبہ کارفرما تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق حاصل ہو سکیں۔

یہ کوئی ادق فلسفہ نہیں جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہری سوچ کی ضرورت ہو۔ یہ ایک آسان اور سادہ سی حقیقت ہے جس سے ہم پوری طرح آشنا ہیں اور اسی کے مطابق مُصلحین کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا جذبہ ہے جس کے تحت مولانا مودودی کی ملّی خدمات کو جانچتے ہوئے اس بنیادی حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

مُصلحین اور رہنمایانِ قوم کی حیثیت اطبا کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک طبیب ایک مریض کے مزاج اور دیگر احوال کو سامنے رکھ کر مختلف اوقات میں اس کے لیے مختلف دوائیں تجویز کرتا ہے بالکل اسی طرح قوم کے خادم بھی اُس کے احوال کے مطابق اصلاحِ حال کی کوششوں میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی تہ میں مریض کو مار ڈالنے کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اسی طرح ایک ہی مریض کے لیے بسا اوقات دو مختلف طبیب مختلف علاج تجویز کرتے ہیں اور مریض بیک وقت ایک ہی طبیب سے علاج کرا سکتا ہے۔ اب اگر ایک طبیب کے علاج سے مریض کو ایک حد تک افاقہ ہو جائے تو کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ دوسرا طبیب اس مریض کا دشمن تھا اور آئندہ وہ کبھی اس مریض کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔ اس طرح کی باتیں یا تو احمق لوگ کیا کرتے ہیں یا پھر وہ پیشہ ور لوگ جو اپنی پریکٹس کی اجارہ داری چاہتے ہوں، اور جن کے پیشِ نظر یہ بات ہو کہ مریض چاہے جیئے یا مرے مگر ان کے مطب سے باہر نہ جانے پائے۔

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰